شفق سوپوری شخصیت اور فن

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

مارچ 2016

13HUPH09

हैदराबाद विश्वविद्यालय
University of Hyderabad

مقالہ نگار

منظور حسین کمار

M.A, Med, MPHIL,

نگران

ڈاکٹر نشاط احمد

شعبۂ اردو۔ اسکول آف ہیومانیٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد 500046

MARCH 2016

Doctoral thesis

SHAFAQ SOPORI SHAKSEYAT AUR FAN

SHAFAQ SOPURI AND HIS LITRARY CONTREBUTION

Submitted By

MANZOOR HUSSAIN KUMAR

M.A, Med, M.Phil,

Reg.No:13HUPH09

Under the supervision of

Dr.NISHATH AHMED

Department of Urdu

School of Humanities

University of Hyderabad, Hyderabad 500046

MARCH 2016

فہرست ابواب

پیش لفظ	۱-۶
باب اول: شفق سوپوری سوانح اور شخصیت	۷-۴۷
باب دوم: شفق سوپوری کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ	۴۸-۶۲
باب سوم: ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کی روایت	۶۳-۹۹
باب چہارم: شفق سوپوری کی شعری خدمات کا فنی جائزہ	۱۰۰-۱۳۷
باب پنجم: شفق سوپوری کی نثری خدمات کا تنقیدی جائزہ	۱۳۸-۲۲۲
باب ششم: شفق سوپوری کے ہم عصر شعراء وادباء	۲۲۳-۲۷۸
باب ہفتم: شفق سوپوری مشاہیر ادب کی نظر میں	۲۷۹-۳۱۱
اختتامیہ	۳۱۲-۳۱۸
کتابیات	۳۱۹-۳۲۶

پیش لفظ

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں دل کرتا ہے کہ گفتگو کی جائے اور گفتگو ختم نہ ہو، بلکہ اس کا سلسلہ دراز ہو جائے۔ ایسی شخصیتیں اپنے اندر انفراد کی اتھاہ گہرائیاں رکھتی ہیں جس کا ہر ساحل ان گہرائیوں میں اترنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان اتھاہ نیلے پانیوں کی گہرائیوں میں اندرون کہیں بڑی بڑی تو کہیں ہلکی موجیں موجزن ہوتی رہتی ہیں جن کی ایک ایک ہر ایک ایک نئی کروٹ کی غماز ہوتی ہے۔

سید عبدالقیوم خطائی المتخلص بہ شفق سوپوری ایک شخص کا نہیں بلکہ بصیرتوں کے ایک زندہ عجائب خانے کا نام ہے۔ جب کبھی ان کا قلم جنبش میں آتا ہے تو نہ صرف شاعری میں کمال خوبیوں کے ساتھ چلتا ہے بلکہ نادر و نایاب تحقیقی و تنقیدی خزانوں کے ساتوں در کھل جاتے ہیں۔ عصر حاضر میں اردو کے حوالے سے شفق سوپوری کا شمار ان معدودے چند نوخیز قلم کاروں میں ہوتا ہے، جن کے علم و آگہی اور ذوق و شوق کی انگلیاں شاعری، تنقید، تحقیق، طنز و مزاح، ڈراما نویسی، موسیقی اور فکشن کے اسرار و رموز کو پہچاننے کا بے مثل مادہ رکھتی ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید کا فرمانا درست ہے کہ شفق سوپوری بے شک ایک اہم ترین شاعر ہیں، لیکن شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک محقق، نقاد، کالم نویس، فیچر نگار اور طنز و مزاح نگار بھی ہے، یعنی شفق سوپوری ایک ہمہ جہت تخلیقی فن کار ہے جن کا قلم شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں یکساں طور پر کمال خوبیوں کے ساتھ چلتا ہے اور اب ناول لکھ کر وہ اردو کے فکشن نگاروں کی صف میں بھی شامل ہو گئے''

راقم الحروف کا مقالہ ''شفق سوپوری شخصیت اور فن'' کے عنوان سے ہے۔ اس مقالے میں معروف

شاعر شفق سوپوری کی شخصیت اوران کے فن کومختلف زاویوں کی روشنی میں تحقیقی وتنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: شفق سوپوری کی سوانح اور شخصیت کے عنوان سے ہے۔اس باب میں شفق سوپوری کے خاندانی پس منظر،ان کے بچپن کے حالات، گھریلو زندگی، تعلیم وتربیت، غم روزگار کے جھگڑے، شادی، بھائی بہنوں کی دلچسپیاں، ان کی اہلیہ اور بچوں کے کوائف وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ان کی شخصیت کے حوالے سے بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم: شفق سوپوری کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ان کے مجموعے کلام اور تنقیدی و تحقیقی تصانیف پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے نیز ان کی فکاہیہ تحریروں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان کا حال ہی میں لکھا ہوا ناول ''نیلیما'' کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم: ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کی روایت،، کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کے آغاز وارتقاء کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار میں غزل میں پیش آئے تغیرات کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم: شفق سوپوری کی شعری خدمات کا فنی جائزہ،، کے تحت ہے۔اس باب میں شفق سوپوری کے شعری کلام ''دل خاک بسر'' دشت میں دور کہیں' اور 'بیتے موسموں کے دکھ' پر تنقیدی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب پنجم: شفق سوپوری کے نثری خدمات کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں شفق سوپوری کے تنقیدی وتحقیقی تصانیف کا جائزہ پیش کیا گیا نیز ان کی طنز ومزاح نگاری اور ناول ''نیلیما'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب ششم: شفق سوپوری کے ہمعصر شعراء وادیب' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں وادی کشمیر کے نمائیندہ شعراء وادباء کی مختصر سوانح کوائف' ادبی خدمات کا جائزہ اوران کے کلام کا عصری تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ہفتم: شفق سوپوری مشاہیر ادب کی نظر میں' کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں اردو ادب کے بلند پایہ ناقدین کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ مذکورہ ناقدین کی روشنی میں شفق سوپوری کی ادبی شخصیت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیرنظر مقالے کا آخری حصہ اختتامیہ کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔جس میں مقالے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تلخیص کو پیش کیا گیا ہے۔اختتامیہ کے فورا بعد کتابیات دیا گیا ہے۔یہ ان کتابوں' رسائل وجرائد اور شخصی انٹرویوں پر مشتمل ہے' جن سے مقالے کی تکمیل میں مدد لی گئی ہے۔

اس مقالے کے اختتام پر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں' جن کے فضل وکرم سے ہی یہ مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔راقم اپنے والدین اور اپنی بہنوں کا بے حد شکر گزار ہے جن کی حوصلہ افزائی اور نیک دعاؤں سے آج میں گوہر مقصو کو پہنچنے میں کامیاب ہوا۔میں اپنے نگراں محترم ڈاکٹر نشاط احمد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی باذوق علمی وادبی شخصیت نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی بلکہ مقالے کے اختتام تک مفید مشوروں سے نوازا، میں صدر شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی ''محترم پروفیسر مظفر علی شہہ میری کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ذاتی مصروفیات کے باوجود مجھے وقت وقت پر اپنے عالمانہ مشوروں سے نوازا، اسی طرح میں سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد انورالدین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے نہ صرف مجھے اس مقالے کے دوران رہنمائی کی بلکہ دوران ایم فل بھی انہوں نے میری حوصلہ افزائی اور

رہنمائی کی۔ میں شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کا مشکور وممنوں ہوں جنہوں نے مجھے وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا' ان میں خاص کر پروفیسر رضوانہ معین' ڈاکٹر حبیب نثار' ڈاکٹر عبدالرب منظر' ڈاکٹر عرشیہ جبین' ڈاکٹر محمد کاشف' ڈاکٹر زاہد الحق' ڈاکٹر رفیعہ بیگم قابل ذکر ہیں۔ میں شفیق استاد ڈاکٹر شفق سوپوری کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے نہ صرف اپنی ذاتی کتب خانے سے کتابیں فرہم کیں بلکہ دوران تحقیق ہر ممکنہ تعاون وار کھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ڈاکٹر شفق سوپوری کی اہلیہ ڈاکٹر ریحانہ اختر کا بے حد شکر گزار ہوں' جنہوں نے میرے تحقیق کے دوران بیک وقت ایک استاد اور ماں کا کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں میں شفق سوپوری کے قریبی دوستوں اور معاصرین کا شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے دوران تحقیق ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں مفید معلومات فراہم کیں' ان میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی' پروفیسر شہ پر رسول' پروفیسر شہزاد انجم' پروفیسر عتیق اللہ' ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی' ڈاکٹر سید سراج اجملی' ڈاکٹر راشد انور راشد' رفیق رازؔ' ڈاکٹر نذیر آزادؔ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

میں ان تمام لائبریوں کے منتظمین کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں' جنہوں نے میرے اس مقالے کے حوالے سے مواد فراہم کرنے میں اپنا پورا تعاون دیا 'ان میں ائی۔جی۔ایم لائبریری حیدرآباد' مولانا آزاد لائبریری حیدرآباد' مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ' جامعہ ملیہ یونیورسٹی لائبریری دہلی' کلچرل اکیڈیمی سرینگر کشمیر' اقبال لائبریری کشمیر یونیورسٹی' ڈسٹرکٹ لائبریری اننت ناگ کشمیر اور تحصیل لائبریری بجبہاڑہ کشمیر وغیرہ وغیرہ ۔

آخر میں عبدالغنی بٹ اور پرویز احمد کا شکریہ ادا کرتا ہوں' جنہوں نے انتہائی قلیل وقت میں غلطیوں سے حتیٰ لامکان پاک اس مقالے کی کمپوزنگ کی۔ اس کے علاوہ وہ تمام دوست و

احباب، رشتہ دار میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے رمق برار بھی اس مقالے کی تکمیل کے دوران میری مدد کی۔

حیدرآباد
مارچ ۲۰۱۶ء

راقم
منظور حسین کمار

باب اوّل

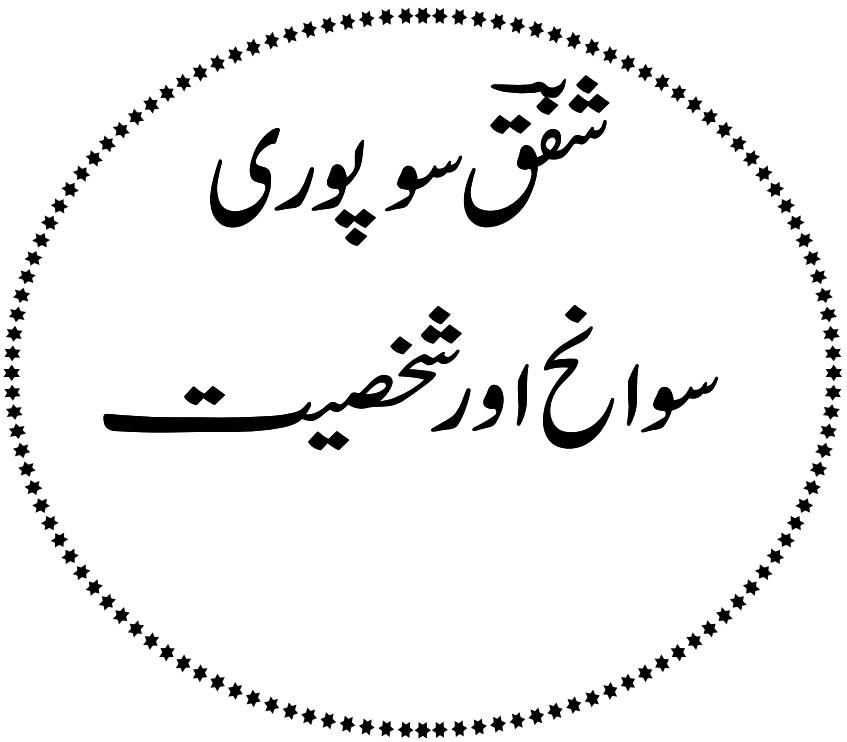

شجرۂ نسب سید عبدالقیوم ختائی المعروف شفق سوپوری

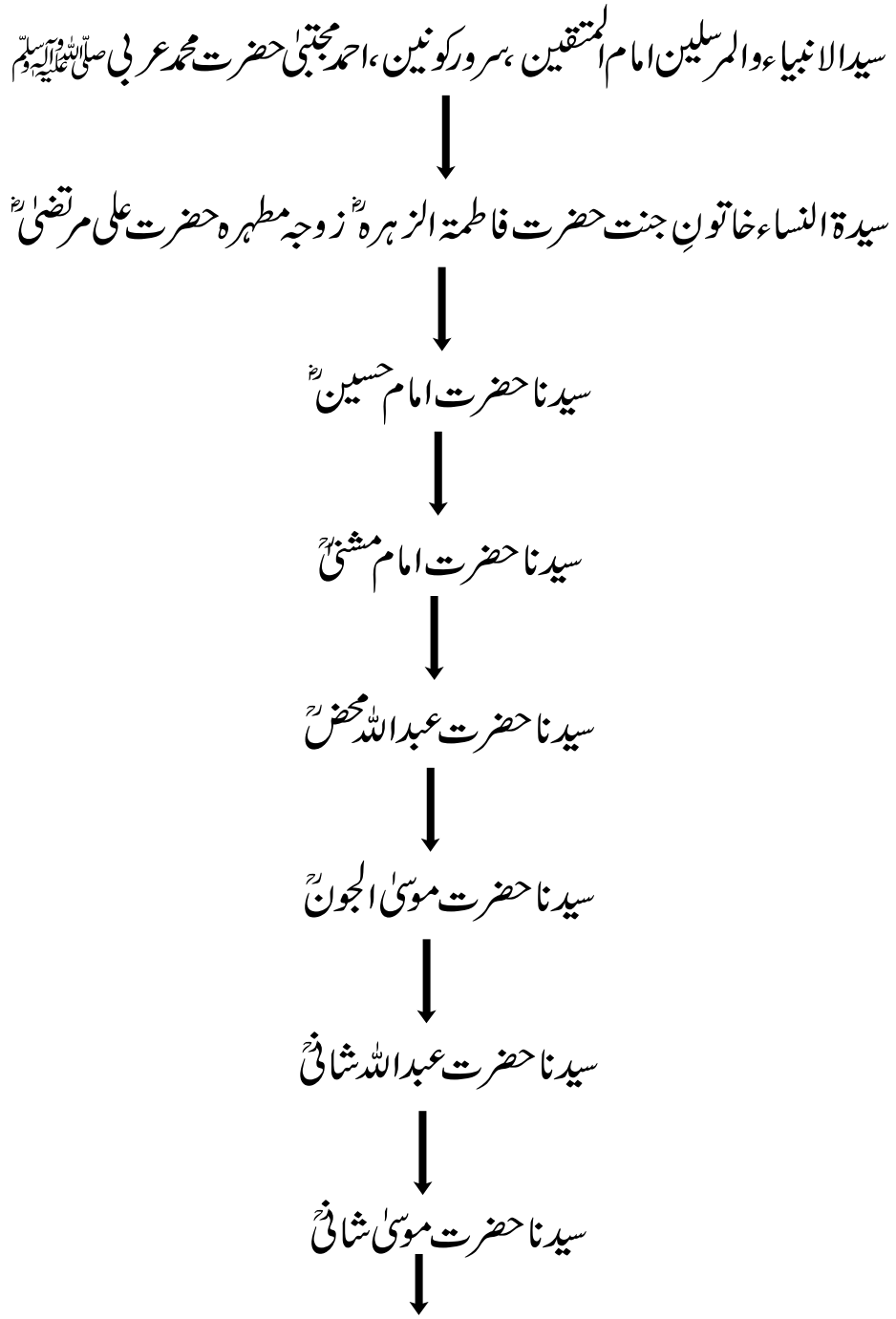

سیدنا حضرت داؤد امیرؒ

سیدنا حضرت محمد رومیؒ

سیدنا حضرت یحییٰ زاہدؒ

سیدنا حضرت عبداللہ الجیلیؒ

قطب الاقطاب، غوث العالم میر میران، پیر پیران محی الدین سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

سید حضرت عبدالرزاقؒ

سید حضرت محمد صالحؒ

سید حضرت محمد علیؒ

سید حضرت محمد مشتاقؒ

سید حضرت محمد مومنؒ

سید حضرت شمس الدینؒ

↓

سید حضرت ظہیر الدینؒ

↓

سید حضرت صدر الدینؒ

↓

سید حضرت مسیح الدینؒ

↓

سید حضرت علاء الدینؒ

↓

سید حضرت زین العابدینؒ

↓

سید حضرت محمد محمودؒ

↓

سید محمد افضل خطائیؒ (خطائی)

↓

حضرت خواجہ سید محمد یوسف خطائیؒ

↓

حضرت خواجہ سید مہدی علی خطائیؒ (زیارت گاہ محلے میں واقع ہے)

↓

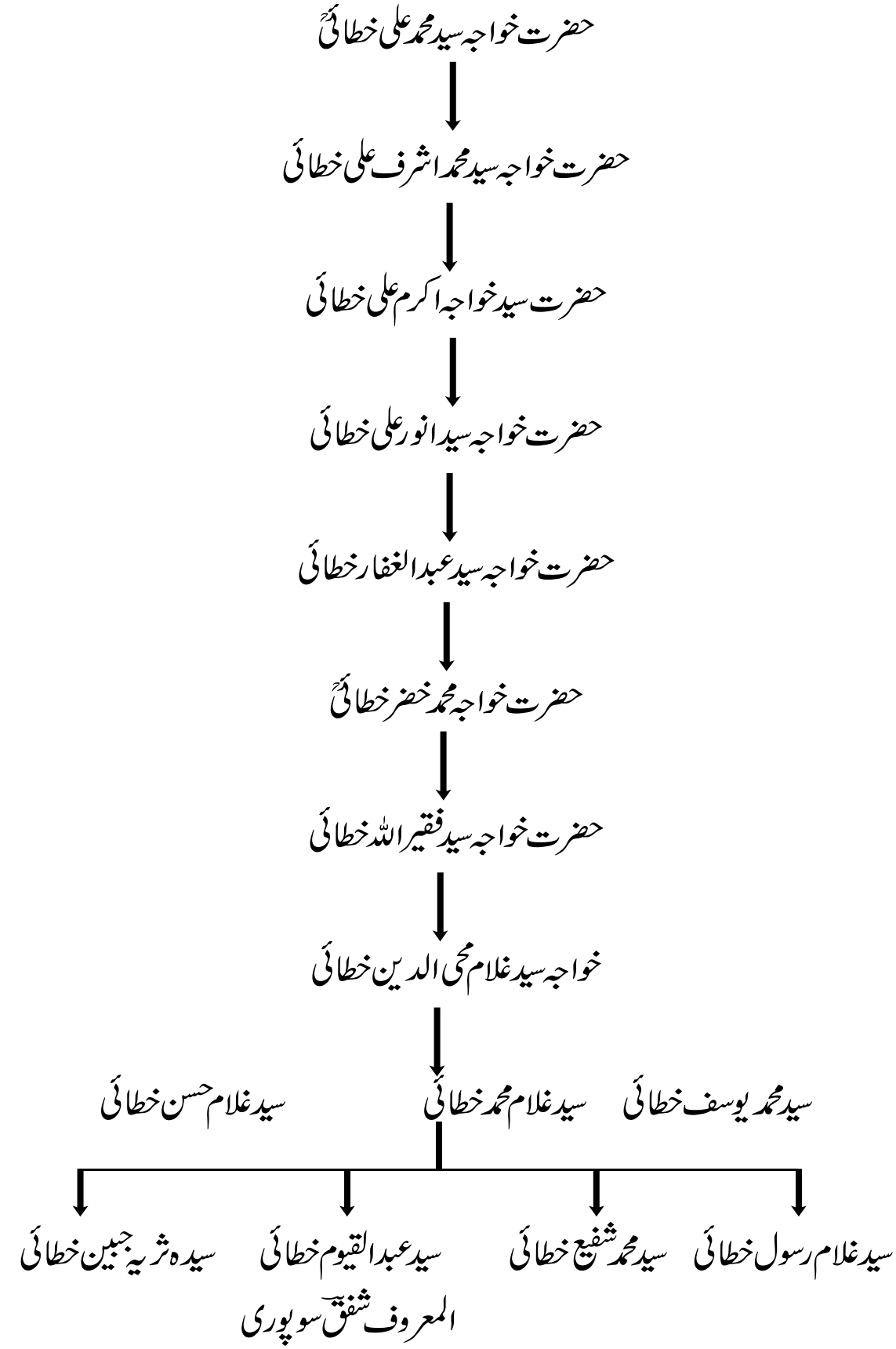
حضرت خواجہ سید محمد علی خطائیؒ
حضرت خواجہ سید محمد اشرف علی خطائی
حضرت سید خواجہ اکرم علی خطائی
حضرت خواجہ سید انور علی خطائی
حضرت خواجہ سید عبدالغفار خطائی
حضرت خواجہ محمد خضر خطائیؒ
حضرت خواجہ سید فقیر اللہ خطائی
خواجہ سید غلام محی الدین خطائی
سید محمد یوسف خطائی
سید غلام محمد خطائی
سید غلام حسن خطائی
سید غلام رسول خطائی
سید محمد شفیع خطائی
سید عبدالقیوم خطائی
المعروف شفقؔ سوپوری
سیدہ ثریہ جبین خطائی

تاریخ کشمیر میں مذکور ہے کہ راجا اونتی ورما کے ایک ہونہار انجینئر ''سویہ'' نے سرینگر سے لگ بھگ پچپن کلومیٹر دور دریائے جہلم کے کنارے پر ایک شہر سویہ پور آباد کیا جس کا نام بگڑتے بگڑتے ''سوپور'' بن گیا۔ وادی کشمیر کے شمال میں واقع اس شہر کی اپنی ایک تاریخی، سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور علمی حیثیت ہے۔ اسی مشہور قصبے کے کنارے پر ایک بستی آباد ہے جسے محلہ عشہ پیر کہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم خطائی المتخلص بہ شفق سوپوری کا جنم اسی محلے کے ایک معزز اور محترم خاندان میں یکم اپریل ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ ا محلہ عشہ پیر کے بزرگوں کی دینی اور علمی خدمات کا اعتراف نہ صرف اہل سوپور کرتے ہیں بلکہ اس پورے علاقے کے لوگ اس بستی کے اکابرین کے معتقد ہیں۔ شفق سوپوری کے والد سید محمد یوسف خطائی ایک سیدھے سادے اور پاکباز پیر تھے۔ شفق سوپوری کے خاندان میں پیر مریدی کا سلسلہ عرصۂ دراز سے چلتا آرہا تھا۔ جو اِن کے والد کے انتقال کے بعد لگ بھگ ختم ہوگیا۔ محمد یوسف خطائی اگرچہ ناخواندہ تھے مگر طول وارض میں موجود اُن کے مرید اور معتقد اُن کے روحانی کمالات کا اب بھی اعتراف کرتے ہیں۔ شفق سوپوری کے دادا خواجہ سید غلام محی الدین خطائی اپنے وقت کے باکمال اور صاحب حال صوفیوں میں تھے۔

شفق سوپوری کی والدہ سعیدہ بیگم سوپور کے ہی ایک آسودہ حال مذہبی اور علمی خاندان میں پیدا ہوئی تھیں۔ سعیدہ بیگم کے نانا مولوی محمد احسن اپنے وقت کے مشہور و معروف اور بارسوخ مفتی تھے۔ سعیدہ بیگم لڑکپن میں ہی اپنے شفیق والد غلام محمد شاہ مخدومی کے سائے سے محروم ہوگئی۔ سعیدہ بیگم کی والدہ شاہ بانو کی شادی محلہ عشہ پیر کے ایک محترم گھرانے میں ہوئی تھی۔ سعیدہ بیگم کے دادا شاہ ولی اللہ مخدومی علاقے کی ایک برگزیدہ شخصیت تھی۔ سعیدہ بانو کے والد غلام محمد شاہ مخدومی کے انتقال کے بعد اس خاندان پر مصائب کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

چنانچہ غلام محمد شاہ مخدومی کے انتقال کے فوراً بعد اُن کے ایک جواں سال فرزند شاہ حفیظ اللہ مخدومی بھی ناگہاں چل بسے۔ اس سانحے کے بعد شاہ بانو پر اپنی کم سِن بیٹی سعیدہ بیگم اور نافہم بیٹے شاہ غلام نبی مخدومی کی پرورش کا بوجھ تنِ تنہا اٹھانا پڑا تاوقتیکہ اُن کی دوسری شادی سید محمد یوسف خطائی کے چھوٹے بھائی مولانا سید غلام حسن خطائی سے ہوگئی۔ اس شادی کے کچھ عرصہ بعد عجیب غیر متوقع حالات میں کم سن سعیدہ بیگم کی شادی محمد یوسف خطائی سے ہوئی جو عمر میں اُن سے کافی بڑے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاندان کس قدر بے سہارا ہو گیا تھا۔ بہرحال سعیدہ بیگم اور محمد یوسف کے یہاں پہلا بیٹا منظور احمد ہوا جو ایک سال کی عمر میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک بیٹی رقیہ پیدا ہوئی جو کچھ مہینوں کے بعد فوت ہوگئی۔ ان سانحات سے دل برداشتہ ہونے والے میاں بیوی کو اللہ نے نا اُمید نہیں کیا چنانچہ اس کے بعد اللہ نے اُنہیں تین اولادوں سے نوازا سید غلام رسول خطائی، سید محمد شفیع خطائی، سید عبدالقیوم خطائی اور ثریہ بانو۔ سید غلام رسول خطائی قصبۂ سوپور اور اس کے گردونواح کی ایک معروف علمی شخصیت کے طور پر کافی مشہور ہیں۔ انہوں نے محکمہ تعلیم میں ایک اُستاد کی حیثیت سے مختلف منازل طے کیں اور بالآخر ایک اعلیٰ انتظامی عہدے پر پہنچ کر سبکدوش ہو گئے۔

سید محمد شفیع خطائی اگرچہ ایک باصلاحیت اور ہُنر مند درزی تھے مگر زندگی کے ایک مخصوص مقام پر انہوں نے اپنے آپ کو دینی اور روحانی تعلیمات اور تحقیقی امور کی نذر کیا۔ چنانچہ اُن کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت اور تحقیق میں گزرتا ہے۔ ثریہ بانو اس وقت محکمہ تعلیم میں ایک امتیازی عہدے پر اپنے فرائض منصبی انجام دے رہی ہیں۔

شفق سوپوری کے خاندان نے ۱۹۹۰ء کے پُرآشوب حالات کے نتیجے میں جزوی طور پر ہجرت کی اور سرینگر میں کئی برسوں تک مختلف جگہوں پر بود باش اختیار کی۔ چنانچہ شفق سوپوری

اس وقت شہر سرینگر کے ایک مضافتی علاقہ گوگوہمہامہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں۔

ایک روایت کے مطابق خطائی خاندان کے جدِ اعلیٰ حضرت سید خواجہ مہدی علی خطائی ملک خطا سے جہانگیر بادشاہ کے عہد میں سوپور تشریف لائے اور محلہ عشہ پیر آباد کر دیا۔ سید مہدی علی خطائی ایک عرصہ تک مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی ارادت میں رہے۔ اُس درگاہِ فیض پناہ سے مذہبی اور روحانی علوم کی تربیت پائی تو شیخ کے فرمان پر ملک کشمیر وارد ہوئے۔ اُن کی قیادت میں سادات کا ایک گروہ تھا۔ یہ سادات مختلف مقامات پر دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کا مقدس فریضہ انجام دیتے رہے۔ سید خواجہ مہدی علی خطائی نے دریائے جہلم کے کنارے اپنے لیے ایک ویران جگہ کا انتخاب کیا جہاں وہ عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ تاعمر تبلیغ کرتے رہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے انہیں اکبر بادشاہ کے دینی الٰہی کے اثرات کو زائل کرنے اور دین اسلام کے اصلی سپرٹ کی تبلیغ کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سوپور اور بارہمولہ میں کئی درسگاہیں قائم کیں جہاں تشنگان علم کو مذہبی اور روحانی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ درسگاہیں اس علاقے میں اپنی نوعیت کی پہلی دانشگاہیں تصور کی جاتی ہیں۔

بچپن

شفق سوپوری کا بچپن اور ان کی جوانی کا عرصہ نہایت عسرت اور سختی میں گذرا۔ انہوں نے جس مفلسی اور تنگدستی کے ماحول میں آنکھ کھولی، اُس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ شفق سوپوری نے بچپن میں ہی یہ حقیقت سمجھ لی کہ کڑی محنت اور صبر کا دامن پکڑ کر ہی عسرت کے خارزار کو پار کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اُن کے بڑے برادر سید غلام رسول خطائی یوں فرماتے ہیں:

''بچپن میں شفق صاحب انتہائی سنجیدہ اور شریف طبع لڑکا تھا۔

خاندانی اثر کے تحت ہمارا زیادہ تر لگاؤ کتابوں سے تھا۔ کھیل کود
اور آزادنہ زندگی کی ہمیں نہ رغبت تھی اور نہ اِجازت۔ چنانچہ
شفق بھی بچپن سے ہی اپنی کتابوں کے ساتھ مصروف عمل
رہتے تھے''۔ ۲

اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندانی اثرات اور گھر کے معاشی حالات کے تحت شفق نے ایک بانظم زندگی کا آغاز بچپن سے ہی کیا ہے۔ شفق سوپوری خود کہتے ہیں کہ

''مفلس ماں باپ کی اولاد ہونے کے سبب محلے کے لڑکے
بچپن میں اُن کو اپنے کھیل کود یا دوسرے مشاغل میں شامل
نہیں ہونے دیتے''۔ ۳

مگر وہ کبھی احساس کمتری کے شکار نہیں ہوئے۔ بچپن میں اُن کا زیادہ تر وقت پڑھائی، گھریلو کام کاج اور تیراکی میں گذرا ہے۔

تعلیم

شفق سوپوری نے ایک سخت مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ بچپن سے ہی انہیں اپنے خاندان کے بزرگوں کے زہد وتقویٰ کی پاسداری کا درس دیا گیا۔ اُن کے والد اگرچہ ناخواندہ تھے لیکن قرآن شریف کا معتدبہ حصہ انہوں نے حفظ کیا تھا۔ چنانچہ شفق سوپوری نے ابتداء میں قرآن مجید کا درس اپنے والد سے ہی لیا۔ بعد میں عربی کی تعلیم اپنے چاچا مولوی غلام حسن خطائی سے حاصل کرتے رہے۔ شفق سوپوری نے مڈل کلاس کا امتحان سوپور قصبہ کے ایک معروف اسکول گورنمنٹ مڈل اسکول تکیہ بل سے پاس کیا۔ بقول شفق سوپوری اُس وقت اس سکول میں قصبہ سوپور کے بہترین اساتذہ کی کہکشاں موجود تھی۔ جن میں ماسٹر غلام احمد گنائی،

پنڈت جانکی ناتھ، پنڈت وشواس ناتھ، ماسٹر حبیب اللہ جامعی، ماسٹر عبدالرجب گورو، ماسٹر محمد یحییٰ، ماسٹر غلام نبی وانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سکول شفق سوپوری کے گھر سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ چونکہ اُن کے چچا اسی سکول میں عربی کے مُدرس تھے لہٰذا اُن کی سرپرستی میں انہیں اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ شفق سوپوری کے خالہ زاد بھائی سید رفیق الحسن قادری یوں فرماتے ہیں:

> ''گورنمنٹ مڈل سکول تکیہ بل ہمارے گھر سے لگ بھگ پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ساری مسافت ہمیں پیدل طے کرنا پڑتی تھی۔ شفقؔ صاحب اکثر ننگے پاؤں ہی سکول جایا کرتے تھے۔ چنانچہ پاؤں میں چھالے پڑتے تھے اور ایڑیاں بُری طرح پھٹتی تھی، کافی دیر تک بوائیوں میں درد ہوتا رہا۔ اس پر اساتذہ کی سخت گیری، وردی نہ ہونے کی وجہ سے چھپ کر سکول میں داخل ہوتے تھے لیکن بعض اوقات پکڑے جاتے اور پٹائی ہوجاتی، بڑے کٹھن دن تھے وہ''۔ ۴

مڈل اسکول تکیہ بل سوپور سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد شفق سوپوری نے گورنمنٹ ہائیر سکینڈری اسکول سوپور میں داخلہ لیا۔ سوپور کے اس تاریخی تعلیمی ادارے میں جن اساتذہ نے شفق سوپوری کے ذہن پر اپنے علمی تبحر کے اثرات چھوڑے اُن میں مولانا قمرالدین مسعودی، ماسٹر بشیر احمد کبابی، ماسٹر عبدالاحد حکیم، ماسٹر غلام محمد، سید محمد حنیف علوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گورنمنٹ ہائیر سکینڈری سکول سوپور میں ہی شفق سوپوری نے اپنی ذات کے اندر جھانک کر اس کائنات اور انسانی وجود کے اسرار رموز پر سوچنا شروع کیا۔ یہیں سے

ان کے دل و دماغ کو سماجی نابرابری نے جھنجوڑا، اس تعلق سے وہ خود کہتے ہیں:

''گورنمنٹ ہائیر سکینڈری سکول کا ماحول مڈل سکول تکیہ بل سے قدرے مختلف تھا۔ مڈل سکول میں لگ بھگ سب بچے غریب گھرانوں سے آتے تھے لہٰذا کوئی خاص امتیاز کی بات نہ تھی۔ لیکن اس نئے ماحول میں زیادہ تر آسودہ حال گھروں سے آنے والے لڑکوں کا رعب داب قائم تھا اس لیے میرے ذہن میں پہلی بار یہ سوال اُٹھا کہ اس سماجی نابرابری کے پیچھے کیا محرکات ہیں۔ میرے والد ان دنوں سیب کے باغوں میں نہایت ہی قلیل مشاہیرے پر مزدوری کر کے مشکل سے افراد خانہ کا پیٹ بھر پاتے تھے۔ ایسی حالات میں والد سے تقاضا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ کٹے پھٹے کپڑے پہن کر سکول جانے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے اپنی ذات میں مخفی جواہرات کی شناخت کی اور جب مجھے یقین ہوا کہ مڈل میں جس تُک بندی کا آغاز میں نے کیا تھا وہ دراصل شاعری ہے اور قدرت نے مجھے شاعری کے گرانبہا خزانے سے مالا مال کیا ہے تب میں نے خدا کی شان تقسیم پر ایمان لایا،،۔ ۵

میٹرک پاس کرنے تک بلکہ آج تک شفق سوپوری اپنے بڑے بھائی غلام رسول خطائی کی سرپرستی میں رہے۔ شفق سوپوری کا تعلیمی کیریئر بنانے میں اُن کے بڑے بھائی کا بہت ہاتھ

ہے۔سوپوری نے کئی دفعہ تعلیم چھوڑ بھی دی مگر اُن کے بڑے بھائی نے انہیں مختلف حربوں سے تعلیم جاری رکھنے پر مجبور کیا چنانچہ ایک واقعہ کا حال غلام رسول خطائی یوں بیان کرتے ہیں:

> ''شفق ہائیر سکینڈری سوپور میں زیر تعلیم تھا۔ میری ڈیوٹی ضلع کپوارہ میں تھی اس وجہ سے مجھے لگ بھگ ایک مہینے کے بعد گھر آنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دفعہ جب میں گھر آیا تو والدہ سے معلوم ہوا کہ شفق نے پڑھائی چھوڑ دی ہے اور وہ ایک ٹیلر ماسٹر کی دکان پر ٹیلرنگ سیکھنے بیٹھا ہے۔ اس معروف ٹیلر ماسٹر کا نام محمد مصطفیٰ صابون تھا۔ اس واقعے سے میں دل برداشتہ ہونے کے علاوہ مشتعل بھی ہوا اور میں نے چھل دے کر شفق کو پکڑا، اس کی مشکیں کس لیں اور اسکول پہنچایا۔ پھر سارے معاملات طے کر کے اُسے اپنے ایک دوست ماسٹر بشیر احمد کبابی کی نگرانی میں چھوڑا، خدا کا شکر ہے کہ شفق نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، اُس وقت اگر میں نے برمحل کاروائی نہ کی ہوتی تو یہ آج شفق سوپوری نہیں بلکہ ایک ٹیلر ماسٹر عبدالقیوم ہوتے، یہ شفق کی زندگی اور لڑکپن کا ایک دلچسپ واقعہ ہے''۔٦

۱۹۶۷ء میں ہائیر اسکینڈری اسکول سوپور سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد شفق سوپوری نے ڈگری کالج سوپور میں داخلہ لیا یہاں سے انہوں نے ۱۹۸۰ء میں انگلش لٹریچر، عربی اور اُردو کے مضامین کے ساتھ بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ کالج کی فضا نے اُن کی

شاعری میں مزید نکھار لایا، وہ کہتے ہیں:

''کالج کے ایام قدرے آسودگی کے ساتھ گذرے، بڑے بھائی صاحب ٹیچر ہو گئے تھے، تنگ دستی کا دور ختم ہو گیا تھا۔ مگر وہ جو خوف دل میں تھا اُس کی وجہ سے میں مشاعروں سے اگرچہ دور رہتا مگر وادی کے ایک مؤقر روزنامہ ''آفتاب'' میں میری نگارشات تسلسل کے ساتھ شائع ہوتی رہتی تھیں، کالج میں بہت وسیع لائبریری تھی میرا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ ابتداء میں فیض، اقبال اور غالبؔ نے متاثر کیا مگر جلد ہی اُن کے اثر سے باہر آ گیا۔ کالج میں جن پروفیسر صاحبان نے میری حوصلہ افزائی کی اُن میں پروفیسر مشتاق احمد وانی اور پروفیسر شریف الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ جن پروفیسر صاحبان نے میری فکری نشو ونما کی اُن میں پروفیسر عبدالغنی بٹ، پروفیسر غلام رسول بچہ، پروفیسر سید محمد لطیف علوی، پروفیسر محمد مظفر وار، پروفیسر حبیب اللہ زرگر، پروفیسر عبدالرحیم راہی، پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر عالی وغیرہ قابل ذکر ہیں''۔ ۷

۱۹۸۰ء میں ڈگری کالج سوپور سے گریجویشن کرنے کے بعد ڈاکٹر شفق سوپوری نے ۱۹۸۱ء میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں داخلہ لیا۔ اگرچہ اُن کے بڑے بھائی نے انہیں شعبہ انگریزی میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا تھا مگر شفق سوپوری نے اُردو زبان سے گہرے

میلان کی وجہ سے بڑے بھائی کے مشورے پر عمل نہ کیا اس سے اُن کی دوراندیشی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔سوپور کے مقابلے میں سرینگر کا ماحول کئی اعتبار سے مختلف تھا۔کشمیر یونیورسٹی کے پُرفضا ماحول اور شعبۂ اُردو کی علمی اور ادبی سرگرمیوں نے اُن کے شعور کو اور بالیدگی عطا کی۔انہیں جن اعلیٰ پایہ کے ادیبوں،شاعروں اور اساتذہ کی رہبری اور رفاقت حاصل ہوئی، اُن میں پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر شکیل الرحمان، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر جعفر رضا، پروفیسر نذیر احمد ملک، پروفیسر محمد زماں آزردہ اور ڈاکٹر برج کرشن ایمہ قابل ذکر ہیں۔ شعبۂ اُردو سے باہر جن مقتدر علمی اور ادبی شخصیات نے شفق سوپوری کی ادبی شخصیت کو مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں پروفیسر قاضی غلام محمد، پروفیسر رحمٰن راہی، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر غلام رسول ملک، پروفیسر گلشن مجید، پروفیسر بشیر نحوی، پروفیسر رشید نازکی، پروفیسر ایوب پریمی، پروفیسر شمس الدین احمد اور پروفیسر محمد امین اندرابی قابل ذکر ہیں۔

کشمیر یونیورسٹی کے ماحول میں شفق سوپوری کی تخلیقی سرگرمیوں میں تیزی آئی اور اُن کی ایک پہچان قائم ہونے لگی۔شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سے شفق سوپوری نے ۱۹۸۲ء میں پوسٹ گریجویشن کی وہ ایم فِل کا داخلہ فوراً نہ لے سکے کیونکہ اسی اثنا اُن کے والد مرض الموت میں مبتلا ہو گئے اور وہ یونیورسٹی چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے۔۱۷/اکتوبر ۱۹۸۳ء کو اُن کے والد اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔کچھ مدت کے لیے شفق کی زندگی بے مزہ ہوگئی،ایسی حالت میں وہ اپنے بڑے بھائی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے چار برس کے وقفہ کے بعد ایم فل میں داخلہ لیا۔

۱۹۸۸ء میں شفق سوپوری نے ایم فل میں داخلہ لیا۔انہوں نے ایم فل کا مقالہ بہ عنوان ''غ۔م۔طاؤس فن اور شخصیت'' پروفیسر قدوس جاوید کی نگرانی میں مکمل کیا۔۱۹۹۱ء

میں انہیں ایم فل کی ڈگری تفویض ہوئی اور اسی برس پی ایچ ڈی کے لیے اُن کی رجسٹریشن ہوئی۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ بہ عنوان ''اردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے عناصر'' بھی انہوں نے پروفیسر قدوس جاوید کی نگرانی میں ہی مکمل کیا۔ ۱۹۹۴ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے یہ دونوں موضوعات اپنی نوعیت کے اعتبار سے نئے اور انوکھے تھے وہ اس طرح کہ غ۔م۔طاؤس کی شخصیت اور فن پر کوئی مطبوعہ کام نہیں ہوا تھا بلکہ مختلف ادیبوں نے اُن کا ذکر سرسری طور پر کیا تھا۔ اسی طرح سے شفق سوپوری کے لیے ہندوستانی موسیقی اور اردو غزل کے بیچ فنی اور ثقافتی ربط کی نشاندہی کرنا بھی ایک کار دار دوالا معاملہ تھا۔ اس مقالے کو لکھنے کی دُھن میں شفق سوپوری نے کئی برس تک ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی تربیت عملاً حاصل کی۔

ایم فل اور پی ایچ ڈی کے زمانے میں شفق سوپوری نے ریسرچ کے سلسلے میں جو محنت کی اور جس طرح موضوع کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اس کے بارے میں پروفیسر قدوس جاوید کا کہنا ہے کہ

> ''میں نے نہ جانے کتنوں کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کروایا لیکن آج تک شفق سوپوری جیسا ریسرچ اسکالر کوئی دوسرا نہیں پایا۔ شفق سوپوری کسی بھی موضوع کو اس کی تمام تر تہوں اور طرفوں کو اُدھیڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کے عادی ہیں۔ چونکہ خود شاعر ہیں اور شاعری کے لسانی، فنی، فکری اور جمالیاتی پہلوؤں کو تمام تر خوبیوں کے ساتھ برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس لیے جب

انہوں نے غ۔م۔طاؤس کی شخصیت اور شاعری کو اپنے ایم فل کے مقالے کا موضوع بنایا تو اُس وقت طاؤس پر کسی نے کوئی مقالہ بھی نہیں لکھا تھا۔ چنانچہ شفق نے طاؤس کی شخصیت کی گمشدہ کڑیوں کو نہ صرف ڈھونڈا، نہ صرف جوڑا اور تسلسل قائم کیا بلکہ اُن کی شخصیت کا ایک دلکش اور حقائق پر مبنی خاکہ بھی مرتب کیا۔ اسی طرح طاؤس کی شاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بھی شفق صاحب نے شاعری کے فن سے متعلق اپنے علم و آگہی کی بنیاد پر لیا۔ طاؤس کے اشعار کی توضیح و تعبیر جو شفق نے پیش کی اُس سے ان کی شعر فہمی اور تنقیدی شعور کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ میرے مشورے پر شفق نے ایم فل کا یہ مقالہ بعد میں کتابی صورت میں شائع کروایا۔ خاص طور کشمیر کے ادبی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ شاعری میں معنی آفرینی، مضمون آفرینی، حسنِ بیان وغیرہ باتوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن شاعری میں اگر غنائیت نہ ہو تو شاعری بے جان سی لگتی ہے۔ دراصل یہی وہ شعور تھا جس نے شفق کو اردو غزل میں موسیقیت کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے پر اُکسایا۔ لیکن مقالہ لکھنے سے پہلے اور اس کے دوران میں شفق نے علم موسیقی کا نہ صرف گہرائی سے مطالعہ کیا بلکہ موسیقی کی تربیت بھی لی۔ شاعری میں الفاظ کی غنائیت سے

بھر پور لسانی برتاؤ کی اہمیت کو بھی سمجھا خاص طور پر شفق نے ہندوستانی موسیقی کے اسرار و امکانات اور راگ راگنیوں کے مضمرات کو بڑی گہرائی سے سمجھا۔ عملی طور پر خود اس کی مشق کی، راگ راگنیوں میں صوتی نشیب و فراز لب و لہجہ کے اتار چڑھاؤ پر توجہ دی۔ اور پھر اُردو شاعروں ولؔی، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے یہاں ہندوستانی راگ راگنیوں کے برتاؤ کی مثالیں پیش کیں۔ شفقؔ سے پہلے اس پہلو سے اردو شاعری اور شاعروں کا جائزہ پورے برصغیر میں کسی نے نہ لیا تھا اس لیے شفق نے پی ایچ ڈی کے مقالے کا امتحان لینے کے لیے پروفیسر رشید حسن خان، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر شیام لال کالرا جیسے مقتدر اور باکمال محققین اور نقاد مقرر کئے گئے تھے۔ ان حضرات نے یہ اعتراف کیا کہ ولؔی، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ نے اپنی شاعری میں کہاں کہاں، کن کن راگنیوں میں اشعار کہے ہیں اس کا علم انہیں بھی نہیں تھا''۔ ۸

ملازمت

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں شفق کے والد سخت بیمار ہو گئے اور انہیں ان حالات میں ایم فل چھوڑ کر گھر واپس آنا پڑا۔ ۱۹۸۴ء میں وہ سوپور کے ایک معروف تعلیمی ادارے مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ میں اردو ٹیچر کی حیثیت سے تعینات ہوئے، اس سکول میں انہوں نے نامساعد حالات میں نہایت قلیل مشاہرے پر اپنے فرائض منصبی انجام دیئے۔ اس دور کا نقشہ

وہ اپنی نیم سوانح حیات میں یوں کھینچتے ہیں:

''یہ وہ دور تھا جب ہمارے مکان کی مرمت کرنے والے مستری بھی ہمیں احساس کمتری میں ڈال کر ہمارے بزرگوں پر یہ باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ ہم میں کوئی قابلیت اور صلاحیت موجود نہیں''۔۹

مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ سوپور کے ایک منتظم کے سخت گیر رویے کا خاکہ شفق سوپوری ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

''انٹرویو میں آپ نے کہا تھا کہ آپ شعروشاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں ہم نے سنا ہے کہ عاشقی شاعری کی غذا ہے تو آپ عاشقی بھی فرماتے ہوں گے۔ اچھا یہ بتایئے کہ آپ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو صفحہ قرطاس پر اُتارتے ہیں یا پھر سینہ بہ سینہ ہی منتقل کردیتے ہیں۔ (سینہ بہ سینہ کہتے وقت انہوں نے آنکھ ماری تھی)۔ سُنیے یہ پبلک سکول ہے کوئی دبستان نہیں جہاں آپ کے نالے سن کر بلبلیں غزل خواں ہوجائیں گی۔ یہاں کی زمینوں میں طبع آزمائی سے اجتناب کریں اور ہاں یہ جو آپ نے شانوں پر گھنگھور زلفیں پریشان رکھی ہیں ہر چند کہ ایسا اگلے زمانوں میں شہزادوں، فلسفیوں، مفکروں، فنکاروں اور دانشوروں کا وطیرہ تھا مگر اس دور میں نقلی درویش، چرسی اور مجذوب ہی گیسو دراز ہوتے ہیں''۔۱۰

شفق سوپوری نے ۱۹۸۶ء میں یہ نوکری چھوڑ دی مگر اس دوران اس ادارے سے وابستہ جن شخصیات نے انہیں متاثر کیا اُن میں سید محمود الموسوی، ماسٹر پیر سیف الدین، ماسٹر عبدالخالق ڈار، محترم محمد مقبول میر قابل ذکر ہیں۔ بعدازیں شفق نے ایک ٹریول ایجنسی کی ملازمت کے سلسلے میں پہلی بار ۱۹۸۶ء میں دہلی کا سفر کیا لیکن وہاں مطالعے اور تخلیقی سرگرمیوں کے لیے جب وقت نہ پایا تو واپس گھر لوٹ آئے اور سوپور کے ایک مضافاتی گاؤں وارہ پورہ میں واقعہ ایک پبلک سکول میں کچھ مدت کے لیے مدرسی اختیار کی۔

۱۹۸۸ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک انہوں نے ڈگری کالج ہندوارہ، گرلز کالج بارہمولہ اور ڈگری کالج سوپور میں بحیثیت ایڈہاک لیکچرر کام کیا۔ ۱۹۹۰ء میں اُن کا تقرر محکمۂ تعلیم میں ٹیچر کے حیثیت سے ہوا مگر جلد ہی اس نوکری سے مستعفی ہو گئے کیونکہ پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنے کے لیے انہیں جو وقت، فرصت اور محنت درکار تھی وہ نوکری کی وجہ سے بہم نہیں ہوتی۔ ۱۹۹۲ء میں شفق سوپوری کا انتخاب کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرر ہوا مگر بعض علم دشمن اور شورش پسند عناصر نے اُس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر حامدی کاشمیری کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر اس ضمن میں آرڈر نکالنے سے باز رکھا اور یوں کشمیر یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو ایک باہُنر اُستاد کی خدمات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۹۹۳ء میں شفق سوپوری کا تقرر پبلک سروس کمیشن حکومت جموں وکشمیر کی طرف سے کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ہوا۔ چنانچہ محکمۂ اعلیٰ تعلیم میں وہ ترقی کے مختلف مراحل طے کر کے اس وقت ایسوسیٹ پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں۔ شفق سوپوری نے اپنی نوکری کے دوران ڈگری کالج ہندوارہ، ڈگری کالج لیہہ، گرلز کالج اُدھمپور، امر سنگھ کالج سرینگر اور ڈگری کالج بمنہ میں اپنی علمی اور تدریسی صلاحیتوں کے انمٹ نقوش

چھوڑے۔اس دوران جن شخصیات نے اُن کے ساتھ مربیانہ سلوک روا رکھا اُن میں پروفیسر عبدالرحیم راہی، پروفیسر ڈورجے سیوانگ، پروفیسر غلام محمد ڈار، پروفیسر غلام قادر صوفی، پروفیسر احسان الحق، پروفیسر غلام محمد تبت بقال، پروفیسر بشیر احمد شاہ، پروفیسر مشتاق احمد وانی قابل ذکر ہیں۔

شفق سوپوری کو حکومت جموں کشمیر نے ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۹ء تک ریاستی کلچرل اکیڈیمی کا ڈپٹی سیکرٹری تعینات کیا۔ یہ خدمات محکمۂ اعلیٰ تعلیم سے مستعار لی گئی تھیں۔اکیڈیمی میں اپنے قیام کے دوران سوپوری نے اٹھارہ سال کے عرصہ کے بعد اکیڈیمی کا خبرنامہ پھر سے جاری کردیا اور اُردو زبان کے جریدے ''شیرازہ'' کا اشاریہ ترتیب دیا۔اکیڈیمی میں کئی اہم پروجیکٹوں پر کام کررہے تھے مگر بعض حالات سے دل اوب گیا اور اپنے محکمے میں واپس چلے گئے۔کلچرل اکیڈیمی میں ملازمت کے دوران جن اصحاب سے شفق سوپوری کے قریبی تعلقات رہے اُن میں جناب ظفر اقبال منہاس، ڈاکٹر رفیق مسعودی، جناب محمد اشرف ٹاک، جناب فاروق مرزا، جناب ہارون رشید، جناب ظفر مظفر، محترمہ فرحت لون وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ازدواجی زندگی

شفق سوپوری کی شادی ریحانہ اختر سے ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔ ریحانہ اختر ضلع اننت ناگ کے ایک باثروت، موقر اور ممتاز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔اُن کے والد خواجہ غلام نبی شاپُو کے پردادا خواجہ خیرالدین شاپو تجارت کے سلسلے میں کشتواڑ سے ہجرت کرکے کشمیر میں آباد ہوئے تھے۔ ریحانہ اختر کے دادا خواجہ غلام حسن شاپو ضلع اننت ناگ کے اہل دول میں شمار ہوتے تھے۔ ریحانہ کے والد خواجہ غلام نبی شاپو نوکری کے سلسلے میں لگ بھگ دو دہائیوں تک

ضلع کپواڑہ میں سکونت پذیر رہے وہ محکمۂ مال کے ایک باہُنر اور باصلاحیت ملازم کے طور پر پورے علاقے میں جانے جاتے تھے۔ یکم اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ایک عسکری کاروائی کے بعد جو دردناک سانحہ ہندوارہ میں پیش آیا اُس میں خواجہ غلام نبی شاپو دوسرے معصوموں کے ساتھ لقمۂ اجل بن گئے۔ ہندوارہ کی سرزمین سے جذباتی اُنس کی بنیاد پر اس خاندان نے نہایت نامساعد حالات کے باوجود ہندوارہ کو ہی اپنا مستقر مان کر وہی بود باش اختیار کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریحانہ اختر کی والدہ امینہ بیگم اننت ناگ کے ایک معروف مقام ڈوروشاہ آباد کے اُس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جس میں کشمیری زبان کا عظیم المرتبت شاعر 'رسول میر' پیدا ہوا تھا۔ امینہ بیگم کے والد یعنی ریحانہ اختر کے نانا عبداللہ میر پورے علاقے میں اپنی دیانت، عبادت وریاضت اور روحانی کمالات کی وجہ سے معروف تھے۔ امینہ بیگم کی والدہ یعنی ریحانہ اختر کی نانی ''جنت بیگم'' اسم بامسمیٰ تھیں۔ اس نیک اور بزرگ خاتون نے ساری عمر زہد و تقویٰ کے سائے میں بسر کی۔ اس وقت ریحانہ اختر کے دو بڑے بھائی ارشد حسین شاپو اور بلال احمد شاپو ہندوارہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں۔ ریحانہ اختر نے کشمیر یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے اور اس وقت وہ محکمہ تعلیم میں اردو کی لیکچرر ہیں۔ موصوفہ نہایت سگھڑ اور سلیقہ مند خاتون ہیں۔ خود ڈاکٹر شفق سوپوری اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میری شخصیت بنانے میں اُن کی والدہ، بڑے بھائی اور ریحانہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور اس وقت میرے لیے میری تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں ریحانہ کا تعاون کافی اہم ہے۔ اس سلیقہ شعار خاتون نے میری شخصیت کو سنوارنے اور سجانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ میرے لیے ریحانہ ایک سنگ تراش کی حیثیت رکھتی ہے جو پتھر کی چٹان سے غیر ضروری حصہ کاٹ کر مورتی تراشتا ہے۔

شادی کے ایک سال بعد جون ۱۹۹۷ء میں شفق سوپوری کے یہاں ایک بیٹی ہوئی جو پیدائش کے تیسرے دن اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اُس وقت شفق سوپوری لیہہ میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے لیکن قیام جموں میں تھا۔ چنانچہ نہایت ہی بے بسی، بے چارگی اور کسمپرسی کی حالت میں انہوں نے اپنی لختِ جگر ''رومانہ عظمت'' کو گوجر نگر جموں کے قبرستان میں خود اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کیا۔ فرماتے ہیں:

> ''یہ میری زندگی کا وہ نازک دور تھا جب میں ہر طرف سے نا اُمید ہو گیا تھا۔ کیا دوست، کیا احباب، کیا رشتہ دار سب بیگانے ہو گئے تھے۔ ہاں البتہ میرے خالہ زاد بھائی سید رفیق الحسن قادری اور اُن کی بیگم پروفیسر رفعت اَمان نے ان حالات میں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا اور مجھے قدم قدم پر کڑے حالات کے خلاف لڑنے کا حوصلہ دیتے رہے۔ یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا''۔۱۱

بعد ازاں ۲۰۰۳ء میں شفق سوپوری کو اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند سے نوازا جس کا نام ''سید محمد سبزان خطائی'' رکھا گیا۔ یہ ہونہار اور حسین و جمیل لڑکا اس وقت شہر سرینگر کے معروف تعلیمی ادارے ٹنڈل بسکو اسکول میں زیرِ تعلیم ہے۔

ادبی سفر

شفق سوپوری نے شاعری کا آغاز مڈل سکول سے ہی کیا تھا۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے ان کی غزلیں، نظمیں، مضامین وغیرہ وادی کشمیر کے روزناموں بالخصوص روزنامہ آفتاب میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ یونیورسٹی میں انہوں نے اپنے شعری مزاج کو ایک واضح سمت

دینے کے لیے اپنے اُستاد گرامی پروفیسر حامدی کاشمیری سے صلح ومشورہ کرنے لگے۔اس دوران میں اُن کا کلام ریاست اور ریاست سے باہر کے ادبی رسالوں میں چھپتا رہا۔جس سے اُن کی ادبی شخصیت ایک وسیع حلقے میں متعارف ہوئی۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ادبی پروگراموں میں متواتر دعوت دی جاتی تھی۔وہ لگاتار ''شب خون'' الٰہ آباد کے شماروں پر تاثراتی مکتوب لکھتے تھے۔جنہیں شمس الرحمان فاروقی بڑے اہتمام کے ساتھ ''شب خون'' کے ایک معروف حصے ''کہتی ہے خلق خدا'' میں شامل کرتے رہے۔اس عمل سے نہ صرف اُن کے شعری مزاج میں نکھار آ گیا بلکہ اُردو کے ادبی حلقے اُن کی شعر شناسی سے واقف ہو گئے۔ شفق سوپوری کا شعری مزاج اُس وقت ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جب اُن کا کلام بیس برس تک شب خون میں نہایت اہتمام کے ساتھ چھپتا رہا اور یہ سلسلہ ''شب خون'' کے بند ہونے تک جاری رہا۔اس دوران شمس الرحمان کی سرپرستی اور اُن کے مفید مشوروں سے اُن کی شاعرانہ صلاحیت میں مزید اضافہ ہوا اور وہ اس حد تک شمس الرحمان فاروقی کی نگاہوں میں مؤقر اور محترم ٹھہرے کہ فاروقی نے جب ''آزادی کے بعد اُردو غزل'' مرتب کی تو اُس میں کشمیر میں موجود شاعروں کی کہکشاں سے صرف رفیق راز اور ڈاکٹر شفق سوپوری کا انتخاب شامل کیا۔

شفق سوپوری کا پہلا مجموعہ کلام ''دل خاک بسر'' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا۔شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی کے ریکارڈ کے مطابق اسی سال اس مجموعے کی رسم رونمائی ایک پُروقار تقریب میں انجام دی گئی۔اس موقع پر پروفیسر گوپی چند نارنگ، مظہر امام، محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ حامدی کاشمیری، قدوس جاوید، برج پریمی اور کشمیر یونیورسٹی کی دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔ اگرچہ ''دلِ خاک بسر'' کی غزلیں ایک نو وارد کا کلام تھا اور اس میں کہیں کہیں کچا پن بھی

نظر آتا ہے مگر کچے پھلوں کا بھی اپنا ایک مزہ ہوتا ہے۔اس مجموعے کی اشاعت نے شفق سوپوری کی شہرت کی بنیاد ڈال دی۔اُردو کے سربرآوردہ نقادوں نے اس پر نہایت حوصلہ افزا تبصرے کئے اور جگہ جگہ پر اس کے شعر بطور حوالہ پیش کئے۔دل خاک بسر کا دیباچہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے تحریر کیا ہے۔

۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر شفق سوپوری کے گیتوں اور نظموں کا مجموعہ ''بیتے موسموں کا دکھ'' منظر عام پر آیا۔اس میں شامل نظموں اور گیتوں میں کہیں میراجیؔ اور کہیں ابنِ انشا کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔شفق نے یہ روش فوراً ترک کی اور اپنی توجہ مکمل طور پر صنفِ غزل کی زلفیں سنوارنے میں صرف کی۔ ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۸ء تک ان کا کلام ''شب خون'' اور دوسرے معیاری رسائل مثلاً ''شاعر'' میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔اس دوران انہوں نے کوئی مجموعہ ترتیب نہیں دیا۔ ۲۰۰۷ء میں ان کی شاعری کا ایک اور مجموعہ ''دشت میں دور کہیں'' منظر عام پر آیا۔اس مختصر مجموعے میں شامل غزلوں کا انتخاب شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا ہے۔''دشت میں دور کہیں'' پر شفقؔ سوپوری کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے اعزاز عطا کیا گیا۔فی الوقت وہ اپنا تیسرا مجموعہ کلام ترتیب دے رہے ہیں اور ان کا کلام ملک اور بیرونِ ملک کے معیاری جرائد میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر جو تصانیف انہوں نے سپردِ قلم کی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ موسیقی شاعری اور لسانیات

۲۔ مخزنِ موسیقی

۳۔ اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی

۴۔ جہات

۵۔ کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ

۶۔ غ۔م۔طاؤس: فن اور شخصیت

اس کے علاوہ شفقؔ سوپوری نے ایک ناول ''نیلیما'' بھی تصنیف کیا ہے۔اس وقت ان فکاہیہ تحریروں کا مجموعہ ''شگفتانے'' زیرِ اشاعت ہے۔

شفقؔ سوپوری ملکی اور ریاستی سطح کی کئی اہم کانفرنسوں اور سیمیناروں میں تحقیقی مقالے پیش کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔وہ تواتر کے ساتھ کل ہند مشاعروں میں بھی شرکت کر رہے ہیں۔

شخصیت

ڈاکٹر شفق سوپوری کی شخصیت میں ذہانت فراست، علمی شوق وادبی ذوق، مہمان نوازی، فراخ دلی، حق گوئی و بے باکی، رواداری اور غور وفکر جیسی ساری صفات شامل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کی شخصیت کے تعمیر وتشکیل میں جہاں اُن کی انفرادی خصوصیات اور رجحانات کا اہم کردار ہے وہیں مذہبی، ثقافتی اور سماجی محرکات نے بھی اُن کی شخصیت بنانے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی شخصیت میں اُن کا مخصوص ذاتی اور خاندانی پس منظر بھی اہمیت رکھتا ہے۔

شفقؔ سوپوری کی ظاہری اور باطنی شخصیت پر اُن کے شاعرانہ مزاج کا گہرا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ وارداتِ قلبی سے لے کر معاملات زیست تک وہ اپنی شاعرانہ طور اور انداز سے سروکار رکھتے ہیں اُن کے سینے میں ایک حساس دل دھڑک رہا ہے۔ چنانچہ جذبات اور احساسات کے تموج سے اُن کی ذات اور شخصیت میں اضطراب اور بے باکی کا عنصر پیدا ہوگیا ہے۔ حالات زندگی کے نشیب وفراز اور تلخ تجربات نے اُن کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ خدا ترسی نے اُن کے دل میں گہرا سوز وگداز پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محبت کو سب جذبوں سے مقدس اور افضل مانتے ہیں۔ نہایت ہی سخت گیر اور پابند نظم ونسق اُستاد ہونے کے باوجود گھر کے اندر اُن کی شخصیت ایک نرم دل اور شفیق انسان کے طور پر نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُن کے برادر اکبر غلام رسول خطائی اس ضمن میں یوں فرماتے ہیں:

''شفق سوپوری کی عادات بہت ہی نفیس ہیں۔ یار باش انسان

ہیں، دوستی کے بے حد قائل ہیں اور بزرگوں کی عزت کرنا
بخوبی جانتے ہیں۔ دوستوں کا احترام کرتے ہیں۔ چھوٹوں
سے شفقت ہے یعنی تمام تر نیک خصلتیں اُن میں بدرجۂ اُتم
موجود ہیں۔ شفق زبردست منتظم ہیں خانہ داری کے حقوق
جانتے بھی ہیں اور نبھاتے بھی ہیں۔ ایمانداری سے ہر کسی چیز
کے ساتھ معاملہ رکھتے ہیں، گھر گرہستی کے معاملات میں
نہایت خلوص اور انکساری سے کام لیتے ہیں۔ رشتہ داروں اور
احباب کے ساتھ نہایت ادب واحترام سے پیش آتے ہیں
اگر چہ مزاج میں ذرا سی تندی ہے مگر عادتاً، فطرتاً اور طبیعتاً بے
حد نرم مزاج رکھتے ہیں''۔ ۱۲

اس سب کے باوجود شفق سوپوری کی ذات کے کسی گوشے میں ایسی چنگاریاں سُلگ رہی ہیں جو کسی بھی وقت دہک کر اُن کے احتجاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ اُن کی ذات کے احتجاج میں ایک توازان اور اعتدال ہے۔ ایک ایسے شخص سے جسے زندگی نے جگہ جگہ پر ٹھوکر ماری ہو، حالات نے حیران و پریشان بنا کر رکھا ہو، جو کسی کو تڑپتا ہوا تڑستا ہوا دیکھ نہیں سکتا، جس کے لیے اپنی قوم کی بدنصیبی سوہانِ روح بن گئی ہو، اس نوع کے احتجاج کا موجود ہونا پُر جواز ہے۔ یہ احتجاج کہیں کہیں اُن کی شاعری میں بھی سر اٹھاتا ہے اور کہیں کہیں معاملات زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شفق سوپوری کا دل انسان کی ازلی بے بسی و بے کسی، اس کی بے اختیاری، اہل دنیا کے جور وستم، طاقتوروں کے استحصالی حربوں، سماجی ناہمواریوں، انسانی ذات کی کشمکش، گناہ وثواب کے گورکھ دھندوں، رشتوں کی پامالی، جذبوں کی بے قدری،

اخلاقی قدروں کی شکستگی، انسانی جانوں کی ارزانی اور بدنصیب قوموں کی غلامی پر کبھی روتا ہے اور کبھی غصے کی صورت میں اس کال چکر کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔

شفق سوپوری کی داخلی اور خارجی شخصیت کسی کشمکش، تضاد یا اختلاف کی شکار نہیں ہے اُن کا اندرون اور بیرون متوازی عناصر سے مرکب ہے۔ اسی وجہ سے اُن کی شخصیت تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ شفق سوپوری کی شخصیت کچھ اصولوں پر استوار ہے۔ ان اصولوں کو نہایت نامساعد حالت میں بھی انہوں نے شکست ریخت سے بچائے رکھا۔ مصلحت پسندی اُن کے خمیر میں نہیں ہے۔ اُن کی بے باکی اور حق گوئی نے اگرچہ انہیں معاملات زیست میں زبردست زیاں سے دوچار کیا ہے۔ تاہم وہ اپنے اصولوں کی پاسداری میں کسی ایسے سرخ رو سپاہ سالار سے کم نہیں جو معرکہ حق و باطن میں زخمی ہونے کے باوجود آخر کار ظفر یابی کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے۔

پسند و ناپسند کا معاملہ شفق سوپوری نے اپنی ذات تک ہی محدود رکھا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی بھی قوت کا جبر قبول کرنے پر کسی بھی صورت میں آمادہ نہیں ہوتے۔ اُن کا یہ معاملہ ہے کہ حسن و قبح میں اپنی صوابدید سے کام لے کر فیصلہ کرتے ہیں اور اسی فیصلے پر قائم بھی رہتے ہیں۔

شفق سوپوری نہایت ہی منکسر المزاج شخص ہیں۔ خاکساری اُن کے خمیر میں رچی بسی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے دوست پروفیسر شہاب عنایت ملک یوں فرماتے ہیں:

> ''شفق سوپوری نہایت ہی شریف اور پُروقار شخصیت کے مالک ہیں۔ نہایت ہی منکسر المزاج شخص ہیں۔ جس طرح کا سوز و گداز اُن کی شاعری میں پایا جاتا ہے اُسی طرح کی نرمی

اُن کی شخصیت میں بھی موجود ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تردُد نہیں کہ اُن کی شخصیت سادگی اور انکساری کا ایک مجسمہ ہے''۔ ۱۳

شفق سوپوری کے ایک اہم معاصر جناب رفیق راز اس ضمن میں یوں فرماتے ہیں:

''شفق سوپوری منکسر المزاج شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ کم گو ہیں، بولنے سے زیادہ سننا پسند کرتے ہیں۔ باایں ہمہ اگر ادبی بحث ہو تو گھنٹوں بولتے ہیں۔ وہ زبردست مزاح پسند ہیں، اور ہر کسی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن انہیں کسی کی غلط بات پر بہت جلد غصہ بھی آتا ہے۔ جھوٹ سے انہیں نفرت ہے اور ہر کسی کے ساتھ سچائی اور ایمانداری سے پیش آتے ہیں''۔ ۱۴

چنانچہ ذات ہو یا فن شفق سوپوری اپنی شخصیت کو عظیم لوگوں کے کارناموں کے سامنے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کو پورے شعور کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ نام ونمود اور شہرت کی اُن کے آگے کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اپنے آپ کو Project کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ نہ وہ اپنے فن کو تولنے میں کسی غلط فہمی کے شکار ہو گئے۔

شفق سوپوری جھوٹ، مکاری، فریب اور عیاری سے نفرت کرتے ہیں۔ اگرچہ سماجی تقاضوں کے پیش نظر انہیں ایسے افراد کو جھیلنا پڑتا ہے جن کی ذات ان قبیح خصائص سے مملو ہے تاہم وہ کسی بھی صورت میں ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتے۔ شفق سوپوری کی اہلیہ ریحانہ اختر ان کی شخصیت کے مزید پہلوؤں پر یوں روشنی ڈالتی ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نہایت سیدھے سادے شخص ہیں۔ان کا دل فتنہ وفساد اور کینہ سے پاک ہے۔جھوٹ سے انہیں نفرت ہے۔مکاری ان کے مزاج میں نہیں البتہ ان کی طبیعت کے لاُبالی پن سے کبھی کبھی مجھے اور میرے بیٹے کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان کی ساری شخصیت شاعرانہ ہے اور وہ اسی وجہ سے دائمی اضطراب اور بے سکونی میں رہتے ہیں۔رشتہ داروں اور دوستوں سے ان کا سلوک نہایت ہی اچھا ہے اگر چہ گھر میں وہ زیادہ تر وقت اپنی ادبی کاوشوں میں گذارتے ہیں تاہم امور خانہ داری میں میرے برابر کے شریک ہیں''۔۱۵

شفق سوپوری ایک وسیع المشرب شخص ہیں۔اُن کا حلقۂ احباب نہایت وسیع ہونے کے باوجود وہ کسی دوست کو شکایت کا موقع نہیں دیتے۔بقول پروفیسر شہاب عنایت ملک ''وہ دوستی کے تقاضوں کو بخوبی جانتے ہیں اور اُن کو نبھاتے بھی ہیں''۔

اسی طرح پروفیسر شہپر رسول فرماتے ہیں:

''شفق سوپوری ہمارے دوست ہیں، بہت زمانے سے ہم اُن کو جانتے ہیں، بحیثیت شاعر بھی بحیثیت انسان بھی۔وہ شاعر بھی بہت اچھے ہیں اور انسان بھی اچھے ہیں''۔۱۶ جب کہ پروفیسر شہزاد انجم شفق سوپوری کی اس خوبی پر یوں روشنی ڈالتے ہیں کہ ''شفق سوپوری بے حد دلنواز اور دلکش شخصیت کے حامل

ہیں۔بحیثیت انسان میں نے اُن کو بے حد اچھا پایا۔ان کا لہجہ
بڑا دلکش اور دل کو لبھانے والا ہے اور ان کا دل محبتوں کے
جذبے سے بھرا ہوا ہے''۔ ۱۷ ڈاکٹر مہتاب نقوی شفقؔ کی
شخصیت کے اس دلنواز پہلو کی وضاحت کچھ اس طرح سے
کرتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ ''شفق سوپوری ہمارے بہت
عزیز ترین دوست ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں، بہت اچھے
انسان ہیں، بہت ہی متواضع آدمی ہیں۔شاعر اور ایسا نیک
آدمی میں نے نہیں دیکھا ہے۔ بہت کم ہی شاعر ایسے ہوتے
ہیں جو اتنے شریف، نیک اور بے لوث ہوا کرتے ہیں''۔۱۸

شفق سوپوری دوستی کا تقاضا بنا کسی غرض اور بغیر کسی مطلب کے نبھاتے ہیں۔لگ بھگ ان کے تمام دوست اس بات پر متفق ہیں کہ شفق سوپوری بے پناہ محبت کرنے والے شخص ہیں۔اُن کے ایک دوست ڈاکٹر راشد انور راشد یوں فرماتے ہیں:

''جب سے مجھے شفق سوپوری سے ملنے کا موقع ملا، میں نے
انہیں بے حد اچھا اور بہت محبت کرنے والا انسان پایا ہے جو
کسی کو چاہتا ہے تو بہت ٹوٹ کے چاہتا ہے اور اُس کے لیے
پھر تمام تر بندشیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔صرف محبت درمیان
میں رہتی ہے اور جو محبت کے سارے تقاضوں کی تکمیل کرتا
ہے۔وہ بے حد مخلص، بے حد شریف اور ٹوٹ کے یعنی دیوانہ
وار محبت کرنے والے انسان ہیں۔وہ جسے چاہتے ہیں اُس

کے لیے ہر مشکل ہنستے ہنستے سہنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ بہت نایاب ہیں۔ اس زمانے میں عام طور پر انسان مصلحت پسندی سے کام لیتا ہے لیکن شفق سوپوری ایسے لوگوں میں ہیں کہ آپ کا رشتہ ایک دفعہ اُن سے قائم ہو گیا، پھر آخری سانسوں تک وہ اس رشتے پر قائم رہتے ہیں اور اس کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں تو بحیثیت انسان میں نے شفق سوپوری کو بہت ہی منکسر المزاج، بے پناہ مشفق اور ہر لحاظ سے بہتر انسان پایا''۔۱۹

آخر پر شفق سوپوری کے ایک محترم دوست ڈاکٹر سراج اجملی کے یہ الفاظ نقل کرنا برمحل ہے۔ فرماتے ہیں کہ

''دوستی اور تعلق کو نبھانے کا طریقہ شفق سوپوری کو خوب آتا ہے۔ وہ بہت ہی منکسر المزاج، سیدھے سادے اور محبتوں سے خاطر داری کرنے والے شخص ہیں۔ ہر ملاقات میں اُن کی شناخت اور نرم مزاجی کا نیا نیا طریقہ سامنے آتا ہے،،۔۲۰

حلیہ

ڈاکٹر شفق سوپوری دراز قد کے مالک ہیں۔ اُن کا جسم اس قدر دُبلا نہیں کہ لاغر لگیں، نہ زیادہ فربہ کہ موٹاپے کا احساس ہو۔ بال اگرچہ بہت گر گئے ہیں مگر وجاہت، خوبصورتی اور وقار میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا ہے۔ پیشانی پر غور وفکر کے وقت جو بل پڑتے ہیں اُن سے دانشوری کا احساس ہوتا ہے۔ بھویں گھنی، آنکھیں کالی مگر گہری، مونچھ چہرے کا ایک اہم اور

خوبصورت حصہ بن گئی ہیں۔ رنگ گندمی، ہونٹ بینگنی رنگ کے، لمبے ہاتھ، دونوں ہاتھوں اور بازوؤں پر گھنے بال۔

لباس

ڈاکٹر شفق سوپوری خوش پوش ہیں۔ اچھا اور معقول لباس زیب تن کرنا پسند کرتے ہیں گھر میں معمولی لباس پہنتے ہیں۔ کُرتا، پہننے سے حتی الامکان پرہیز کرتے ہیں، اُن کی بیگم کا کہنا ہے:

> ''ڈاکٹر صاحب لباس کے معاملے میں سنجیدہ ہیں۔ شادی سے لے کر اب تک وہ میری پسند کے ملبوسات ہی پہنتے ہیں۔ ڈیوٹی نہایت ہی معقول اور دیدہ زیب لباس پہن کر جاتے ہیں۔ خاص کر تقریبات میں شمولیت کے وقت لباس کا خیال رکھتے ہیں۔ اکثر لباس کے معاملے میں عربی کا مشہور مقولہ کہتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کی پہچان اس کے لباس سے ہوتی ہے''۔۲۱

غذا

ڈاکٹر شفق سوپوری غذا کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ وہ بسیار خور نہیں ہیں۔ زیادہ تر اپنے گھر کا کھانا پسند کرتے ہیں۔ گوشت سے زیادہ رغبت نہیں ہے۔ ہاں جب گھر میں بیگم پکاتی ہیں تو ضرور کھاتے ہیں۔ دالیں، سبزیاں اور پنیر پسند کرتے ہیں۔ اپنے کچن گارڈن میں اُگائی ہوئی سبزیوں کو زیادہ رغبت سے کھاتے ہیں۔

مشاغل

شفق سوپوری دن میں ضرور کچھ وقت پھولوں اور پیڑ پودوں کے ساتھ گذارتے ہیں۔خود کہتے ہیں کہ ''میں صبح کے وقت اپنے صحن کے پھولوں اور پودوں سے ملتا ہوں۔اُن سے گفتگو کرتا ہوں اور اُن کا حال دریافت کرتا ہوں۔ ہر پیڑ، ہر ٹہنی، ہر پھول اور ہر پتی کی اپنی ادا ہوتی ہے میں اُسی ادا، اُسی انداز سے اُن سے باتیں کرتا ہوں۔ جب ہوا سنکنے لگتی ہے اور پتے منجیرے بجانے لگتے ہیں مجھے لگتا ہے کہ قدرت اپنے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھاتی ہے۔

کچھ سمجھتے ہیں صبا سے غزل برگِ گلاب
کچھ تو فرہنگِ بیاض گذاراں کھولتے ہیں
بات کرتے ہیں گل و لالہ و رنگ و بو سے
ہم پرندوں کی طرح اپنی زبان کھولتے ہیں،، ۲۲

اس کے علاوہ شفق سوپوری کے مشاغل میں موسیقی کا ریاض بھی شامل ہے۔اگرچہ اس ریاض کی نوعیت باقاعدہ نہیں لیکن بیشتر وقت وہ اپنی غزلوں کی طرزیں بنانے اور انہیں گانے میں گذارتے ہیں۔ان کے اہل خانہ کا کہنا ہے کہ ان کی اس خوبی سے گھر کا ماحول خوشگوار رہتا ہے۔اور یہ کہ اللہ نے انہیں لحنِ داؤدی عطا کیا ہے۔

معمولات

ملازمت کی مصروفیات کے علاوہ شفق سوپوری کے معمولات میں مطالعہ اور تخلیقی سرگرمیاں اہم ہیں۔دس بجے کالج پہنچتے ہیں وہاں سے آکر کچھ دیر امور خانہ داری کی سرانجامی کے لیے صرف کرتے ہیں۔شام کو اپنی فیملی کے ساتھ ٹی وی دیکھتے ہیں اور رات کو دس بجے سے ایک بجے تک مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔اپنی تخلیقات کو سنوارنا سوپوری کے اہم معمولات میں ہے۔اس کے علاوہ ہفتے میں ایک دو دفعہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملاقات کے

لیے جاتے ہیں۔دن میں کچھ وقت ضرور اپنی فیملی کے ساتھ گذارتے ہیں۔اس کے علاوہ نمازیں ان کے معمولات کا اہم حصہ ہیں۔کمپیوٹر پر بہت کم بیٹھتے ہیں زیادہ تر کتابوں کے مطالعے کو ترجیح دیتے ہیں۔ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخباروں اور یونیورسٹی وغیرہ کے لیے مسلسل پروگرام، کالم اور لیکچر لکھتے رہتے ہیں۔

دوست واحباب

پہلے ہی عرض کیا گیا ہے کہ شفق سوپوری ایک وسیع المشرب شخص ہیں اور اُن کا حلقۂ احباب نہایت وسیع ہے۔اُن کے دوستوں میں کچھ ایسی شخصیات بھی ہیں جن کا ادبی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔اُن کے بچپن کے دوستوں میں جناب آزاد محمود آزاد، جناب نثار احمد کھانڈے (انہوں نے دلِ خاک بسر کی اشاعت کا سب خرچہ برداشت کیا تھا)، پیرزادہ نصیر احمد، ڈاکٹر پرویز احمد وانی، ظہور احمد آخون، ڈاکٹر شمیم احمد ڈار اور مرحوم عبدالحق ایسے ہیں جن کی صحبت میں شفق سوپوری نے اپنا بچپن اور اپنی جوانی گذاری۔شفق سوپوری نے اپنے مرحوم دوست عبدالحق سے نہایت گہری محبت کا اظہار اپنا شعری مجموعہ ''دشت میں دور کہیں'' مرحوم کے نام ان الفاظ میں معنون کر کے کیا ہے:

> ''مجھے داغ مفارقت دے کر تمام عمر کے لیے سوگوار بنانے والے جواں مرگ یارِ جانی ''پیرزادہ عبدالحق'' کے نام اس شعر کے ساتھ ؎
>
> چمک رہی ہے جو آئیندگاں کی راہ گذر
> کچھ اس میں روشنی گردِ رفتگاں بھی ہے''

اس کے علاوہ بعد میں شفق سوپوری کے دوستانہ تعلقات جن اشخاص سے قائم ہوئے اُن

میں ڈاکٹر نذیر آزاد، پروفیسر شہاب عنایت ملک، محترم رفیق راز، جناب ظفر اقبال منہاس، جناب خالد بشیر احمد، جناب بشارت بخاری، مرحوم پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر پرکاش چند، جناب منیب الرحمٰن، ڈاکٹر حیات عامر حسینی، پروفیسر سید رضا (مرحوم)، جناب بشیر چراغ، جناب شہناز رشید، قابل ذکر ہیں۔ ریاست سے باہر جن ادبی شخصیات سے ڈاکٹر شفق سوپوری کے دوستانہ تعلقات ہیں اُن میں پروفیسر ابوالکلا قاسمی، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر راشد انور راشد، پروفیسر مظفر علی شہمیری، ڈاکٹر سید سراج اجملی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر شہریار مرحوم، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر حبیب نثار، پروفیسر امین اشرف مرحوم، جناب مظہر امام مرحوم، کرشن کمار طور، ڈاکٹر سیفی سرونجی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جن شخصیات سے ڈاکٹر سوپوری کو قریبی مراسم ہونے کی سعادت حاصل ہے اُن میں خاص طور پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب پروفیسر ابوالکلام قاسمی، جناب پروفیسر حامدی کاشمیری، جناب پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر ظہور الدین، جناب بٹھنا گر شاداب قابلِ ذکر ہیں۔

شفق سوپوری کے یہاں دوستی کے جو بھی معیارات ہیں اُن کا سرچشمہ محبت ہے۔ وہ بہت خلوص کے ساتھ دوستی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور اپنے دوستوں کو اُن کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دل سے چاہتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ دوستوں کے منصب، اونچ نیچ، مذہب یا کسی دوسری چیز کو دخل انداز نہیں ہونے دیتے۔ اُن کے بچپن کے ایک دوست ڈاکٹر پرویز احمد وانی اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> ''ہم لوگ سوپور کے محلہ عشہ پیر میں ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ ہمارے دوستانہ تعلقات قریباً چالیس سال پر محیط ہے۔

شفق سوپوری صاحب نے نصف سے زیادہ عمر تکالیف میں بسر کی مگر ہم دوستوں نے کبھی اُن کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی نہ اُن کی زبان سے گلہ شکوہ سنا۔ ایسی قوت برداشت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ شفق صاحب نہایت ہی مخلص، ہمدرد اور قابل اعتماد شخص ہے۔ مجھے یاد ہے میرے مشکل وقت میں جن لوگوں نے میری مدد کی اُن میں نصیر احمد اور شفق سوپوری اس لیے قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے میرا دھیان تجارت سے ہٹا کر علم کی طرف لگایا اور نتیجہ یہ ہے کہ میں اُن کی کوششوں سے اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے میں کامیاب ہوا۔ اہل سوپور ڈاکٹر صاحب کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ہم دوستوں میں شفق سوپوری ہی ایک ہیں جنہیں خدا نے خاکساری اور تمکنت سے نوازا ہے۔ اتنے بڑے شاعر، ادیب اور دانشور انسان ہونے کے باوجود ہم نے کبھی اُن میں ذرہ بھر غرور، گھمنڈ نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اَنا کو کیسے دبائے رکھا ہے یہ راز وہی جانتے ہیں''۔ ۲۳

اسی طرح اُن کے قریب ترین معاصر اور گہرے دوست ڈاکٹر نذیر آزاد شفق سوپوری کے ساتھ اپنے دوستانہ مراسم کے بارے میں کچھ اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''ہماری دوستی کا آغاز ۱۹۸۸ء میں ہوا۔ تب سے لے کر ہم

نے زندگی کے کئی مراحل ایک دوسرے کے سہارے طے
کئے۔عرصے سے ہمارے درمیان گھریلو تعلقات بھی قائم
ہیں۔ہم ادب اور زندگی کے کسی بھی معاملے پر ایک دوسرے
سے مشاورت کر کے نتیجہ نکالتے ہیں۔میری زندگی کے ہر
معاملے میں شفقؔ نے معاونت کی ہے۔ہماری دوستی کی سب
سے بڑی وجہ ادب ہے،شاعری ہے،تخلیق ہے۔معاصرین
ہونے کے باوجود ہم میں معاصرانہ چشمک نہیں۔مجھے شفقؔ کی
دوستی پر ناز ہے''۔۲۴

شفق سوپوری اپنے اساتذۂ کرام کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔وہ شاگردی کے آداب اور لوازمات سے بخوبی واقف ہیں۔انہیں اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ ان کی علمی اور ادبی شخصیت کی تشکیل میں ان کے اساتذہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور اس احساس کے تحت وہ اپنے تمام اساتذہ کی منت کشی کا جگہ جگہ پر اعتراف کرتے ہیں۔ان کی قابلیت اور صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے جہاں پروفیسر قدوس جاویدیوں فرماتے ہیں:

''مجھے فخر ہے کہ شفقؔ سوپوری نے میری نگرانی میں ایم فل اور
پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔اس سے شفقؔ سوپوری کو جو مقام حاصل
ہوا وہ اپنی جگہ لیکن شفقؔ کے اس کارنامے نے میری بھی توقیر
بڑھادی۔مجھے اس کا اعتراف ہے''۔۲۵

وہیں پروفیسر حامدی کاشمیری شفقؔ سوپوری کی سعادتمندانہ اور نیازمندانہ خوبی کا یوں اعتراف کرتے ہیں:

''شفق سوپوری کو میں اپنے عزیز ترین اور قابل ترین شاگردوں میں شمار کرتا ہوں۔ ہمارے تعلقات لگ بھگ تنتیس برس پر محیط ہیں۔ اس دوران میں نے شفق سوپوری کی شخصیت کے کئی نادیدہ جہانوں کو دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے فن کے نئے جہانوں کو بھی دیکھا۔ شفق سوپوری اپنے اُستادوں کو نہایت قدر، احترام اور تقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شفق جب بھی ہمارے غریب خانے پر آتے ہیں تو ہمیں اُن کی محبت، خلوص اور سعادتمندی دیکھ کر ایک عجیب قسم کی طمانیت اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ شفق بہت عرصے تک کشمیر یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ رہے۔ ایک شاگرد کی حیثیت سے میں نے انہیں نہایت ہوشمند، باسلیقہ اور مہذب پایا۔ وہ اپنے اُستادوں کے سامنے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور اگر مجبوراً کچھ بولنا بھی پڑے تو حدادب کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اتنی ادبی خدمات کے باوجود اور اس قدر شہرت پانے کے باوصف شفق کی ذات میں کسی قسم کی اَنا نہیں پائی جاتی۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ شفق سوپوری جیسا بلند پایہ شاعر اور ادیب میرا شاگرد رہا ہے''۔۲۶

حواشی

۱: اسکول ریکارڈ کے مطابق

۲: سید غلام رسول خطائی، ایک شخصی انٹرویو میں، ۶ ستمبر، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۳: ڈاکٹر شفق سوپوری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۰ اگست ، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۴: سید رفیق الحسن قادری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۵ اکتوبر، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۵: ڈاکٹر شفق سوپوری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۰ اگست، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۶: سید غلام رسول خطائی: ایک شخصی انٹرویو ۶ ستمبر، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۷: پروفیسر قدوس جاوید: ایک شخصی انٹرویو، ۱۴ اگست ۲۰۱۵ بمقام جموں

۸: ہفتہ وار پکار (کشمیر: ۵۔۱۱ مارچ ۲۰۰۹ء)

۹: ایضاً، ۱۶۔۲۹/اپریل ۲۰۰۹ء

۱۰: ڈاکٹر شفق سوپوری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۰ اگست ، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۱۱: سید غلام رسول خطائی: ایک شخصی انٹرویو، ۶ ستمبر، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۱۲: پروفیسر شہاب عنایت ملک: ایک شخصی انٹرویو ۱۳ اگست ۲۰۱۵ء بمقام جموں

۱۳: رفیق راز: ایک شخصی انٹرویو، ۸ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۱۴: ریحانہ اختر: ایک شخصی انٹرویو، ۲۵ اگست ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۱۵: پروفیسر شہپر رسول: ایک شخصی انٹرویو، ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء بمقام دہلی

۱۶: پروفیسر شہپر رسول: ایک شخصی انٹرویو، ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء بمقام دہلی

۱۷: پروفیسر شہزاد انجم: ایک شخصی انٹرویو، ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء بمقام دہلی

۱۸: ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی: ایک شخصی انٹرویو، ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۱۹: ڈاکٹر راشد انور راشد: ایک شخصی انٹرویو، ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۲۰: ڈاکٹر سراج اجملی: ایک شخصی انٹرویو، ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۲۱: ریحانہ اختر: ایک شخصی انٹرویو، ۲۵ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر

۲۲: ڈاکٹر شفق سوپوری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۴ اگست ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۲۳: ڈاکٹر پرویز احمد وانی: ایک شخصی انٹرویو، ۲۶ اگست ۲۰۱۵ء بمقام سوپور کشمیر

۲۴: ڈاکٹر نذیر آزاد: ایک شخصی انٹرویو، ۲۰ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۲۵: پروفیسر جاوید قدوس: ایک شخصی انٹرویو، ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء بمقام جموں

۲۶: پروفیسر حامدی کاشمیری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

باب دوم

شفیق سوپوری
کی ادبی خدمات کا
اجمالی جائزہ

شفقؔ سوپوری کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ لینے سے پہلے پروفیسر قدوس جاوید کا یہ اقتباس نقل کرنا برمحل ہے۔

''شفق سوپوری بے شک ایک اہم ترین شاعر ہیں لیکن شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک محقق، نقاد، کالم نویس، فیچر نگار اور طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ یعنی شفقؔ سوپوری ایک ہمہ جہت تخلیقی فنکار ہیں جن کا قلم شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں یکساں طور پر کمال خوبیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ اور اب ناول لکھ کر وہ اردو کے فکشن نگاروں کی صف میں بھی شامل ہو گئے''۔ا

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شفق سوپوری کی ادبی شخصیت ہمہ پہلو ہے۔ اُن کے کلام کا پہلا مجموعہ ''دل خاک بسر'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ یہ ایک مبتدی کا کلام ہے تاہم کئی مقتدر نقادوں نے اس پر اظہار خیال کیا جو شفق سوپوری کی شہرت کی بنیاد بن گیا۔ اس مجموعے کا دیباچہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے تحریر کیا ہے۔ جو اس اعتبار سے حوصلہ افزاء ہے کہ حامدی نے پہلی بار شفق سوپوری کی شاعری کے محاسن سے لوگوں کو متعارف کرایا۔ لکھتے ہیں:

''شفق سوپوری کشمیر کے جدید شعری منظر نامے میں ایک نو وارد شاعر کے طور پر طلوع ہوئے ہیں.....انہوں نے جس دور میں قدم رکھا ہے وہ پہلی بار اُن کے داخلی وجود کی مخفی شعری قوتوں کی نقاب کشائی کر رہا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں کہ کسی تازہ وارد شاعر کے چند منتخبہ شعری نمونوں سے یہ

رائے قائم کرنے میں دیر نہ لگے کہ وہ اپنے تخلیقی لاشعور میں نمود طلب شعری ذخائر کا مالک ہے۔ اور اس کے کئی اشعار اُن کی رونمائی کا حق ادا کر سکیں۔ شفق سوپوری کی جو غزلیں میری نظر سے گذری، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشقی کی منزل سے نکل کر اب اُس مقام پر آ گئے ہیں جہاں اُن کا تخلیقی ذہن برگ و بار لا رہا ہے اور گردوپیش کی فضا رنگ و روشنی سے منور ہو رہی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کشمیر کی نئی نسلوں میں شفق سوپوری نہ صرف نسبتاً گہرے تخلیقی شعور کا احساس دلاتے ہیں بلکہ وہ لفظ و پیکر کی فراوانی اور تازہ کاری کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ اُن کی شعری فضا میں حد بندی، یک رنگی اور گھٹن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ آزادی، توسیع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ خاصیت نئے شعراء میں بہت کم ملتی ہے''۔ ۲

''دل خاک بسر'' کے اشعار کو اردو کے مقتدر نقادوں نے مختلف جگہوں پر حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کی ایک مثال اردو کے نامور نقاد ساحل احمد کی کتاب ''غزل پسِ منظر، پیش منظر'' ہے جس کے صفحہ ۲۹۹ میں اہم معاصر شعراء کی فہرست میں نہ صرف شفق سوپوری کا نام درج ہے بلکہ کئی جگہوں پر اُن کے اشعار بھی نقل کئے گئے۔

دلِ خاک بسر سے چند اشعار ؎

تنہائیوں کی چھت پر اک حرف داستاں
اک شب عروسِ جاں کو مژگان بھر غنیمت

آج نیا حکم بھی جاری ہوا
اب سے کوئی مجھ کو دغا بھی نہ دے

اُس نے ہی بخشا شجر کو زمزمہ تسبیح کا
شبنمی پازیب میں شب بھر وہی چلتا رہا

ذہن سے پیکر مہربان گرگیا
برق سے پہلے ہی آشیاں گرگیا

موج ہوا کی طرح گذر کیوں نہ گیا تُو
تھے سوختہ جان اور ادھر کیوں نہ گیا تو

شفق سوپوری کا دوسرا شعری مجموعہ ''بیتے موسموں کے دکھ'' ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا۔ گیتوں اور نظموں پر مشتمل اس مجموعے کا دیباچہ خود شفق سوپوری نے لکھا ہے جب کہ اس کی تقریظ ''ڈاکٹر ایوب پریمی'' نے لکھی ہے۔ ان گیتوں اور نظموں میں کہیں کہیں بگتی تحریک سے وابستہ شعراء کے علاوہ میراجی اور ابن انشاء کا اثر نظر آتا ہے۔ اگرچہ شفق نے اپنے گیتوں میں روایتی طرز اختیار کیا ہے تاہم ان کے اندر جدت کے عناصر بھی موجود ہیں۔ شفق

کی گیت نگاری پر آنے والے صفحات میں کھل کر بات ہوگی۔

شفق سوپوری کا تیسرا شعری مجموعہ ''دشت میں دور کہیں'' ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے پر شفق سوپوری کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی سے اعزاز حاصل ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۸۹ء سے لے کر ''شب خون'' کے بند ہونے تک شفق کا کلام تواتر کے ساتھ ''شب خون'' میں چھپتا رہا۔ اور اس دوران شفق سوپوری کا شعری مزاج پختہ ہو چکا تھا اور اُن کے طرز بیان کو ایک امتیازی مقام حاصل ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس شعری مجموعے کا انتخاب شمس الرحمان فاروقی نے کیا ہے اور شفق کی شاعرانہ انفرادیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ اردو زبان کے بلند مرتبت شاعر، فکشن نگار اور نقاد پروفیسر ''سید امین اشرف'' نے تحریر کیا ہے۔ جن کا یہ کہنا ہے کہ شفق کی شاعری نئے تخلیقی امکانات اور اُن کے روشن مستقبل کا سراغ دیتی ہے۔ انہوں نے جس طرح اپنے عہد کی سچائیوں سے تخلیقی سروکار اور لفظوں کی ازلی حرمت کا خیال رکھا ہے وہ ایک فن کار کے لیے بڑی سعادت ہے۔

''اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی'' ڈاکٹر شفق سوپوری کی ایک ایسی تصنیف ہے جو موضوع کے حوالے سے بالکل منفرد ہے۔ اس کتاب کے موضوع کی اہمیت اس بات سے بخوبی لگائی جاسکتی ہے کہ اس پر شمس الرحمان فاروقی نے دیباچہ تحریر کیا ہے۔ فاروقی کا یہ کہنا نہایت اہم ہے کہ:

> ''ہمارے نوجوانوں میں شفق سوپوری تنہا ہیں جو ان موضوعات پر غور وخوض کرتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے کچھ اور مسائل بھی اٹھائے ہیں، خاص کر غزل کے بعض شعراء نے جو بحریں بھرتی ہیں اُن کا تجزیہ، اُن کی

ردیفوں کا تجزیہ، اُن کی پس آمد اور اب سب سے بڑھ کر یہ کہ
مشہور مغنیوں کی گائی ہوئی فہرست اور اُس راگ کی صراحت
جس میں وہ غزل گائی گئی ہے، ان معلومات نے اس کتاب کو
بہت قیمتی بنا دیا ہے۔ یہ کتاب ایک بڑی کمی کو پورا کرتی
ہے''۔ ۳

''اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی'' کے باہمی تعلقات اور ثقافتی انسلاکات کو تلاش کرنے کی اہمیت کے بارے میں خود شفق سوپوری یوں رقمطراز ہیں:

''اگرچہ اردو غزل اور غزل گو شاعروں پر اب تک دفتروں
کے دفتر رقم کئے گئے ہیں۔ تاہم میری دانست میں غزل کی
موسیقیت اور اس کے غنائی عناصر کو ہندوستانی موسیقی کے
مزاج کی مطابقت کے ساتھ آج تک نہیں دیکھا گیا ہے۔ میں
نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ دیکھا جائے ہندوستانی
موسیقی میں اُردو غزل پر کیسے اثرات مرتب کئے اور ان
اثرات کی نوعیت کیا ہے اور کس طرح ان اثرات کو قبول کر کے
اردو غزل ہندوستانی کلچر کا ایک حصہ بن گئی۔ یہ دیکھنا بھی
ضروری تھا کہ کس طرح اردو غزل نے ہندوستانی موسیقی کی
خصوصیات اور تقاضوں کے پیش نظر اپنی خارجی اور داخلی
ہیئت میں لچک پیدا کر لی''۔ ۴

اس کتاب میں اردو غزل کے غنائی عناصر کا جائزہ لینے کے لیے شفق سوپوری نے ولی دکنی،

میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؒ اور حسرت موہانی کا انتخاب کیا ہے۔ یہ شعراء چونکہ اپنے عصر، مزاج اور اہمیت کی وجہ سے ممتاز ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرح سے یہ کتاب پوری اُردو غزل کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کتاب میں شفق سوپوری نے ان شعراء کے کلام کے عروضی مطالعے کے ساتھ ساتھ ردیف اور قوافی اور صوتی فضا کی کارفرمائی کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ہر شاعر کے اوزان اور ردیف اور قافیہ کی ایک جدول تیار کی ہے۔ جن کے تقابلی جائزے کے بعد مختلف فنکاروں کی گائی ہوئی غزلوں کی جدول سے اُن کا تقابل کیا ہے اور آخر پر اُن اوزان کی نشاندہی کی ہے جو ہندوستانی موسیقی کے مزاج سے مطابق رکھتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر پروفیسر شمیم حنفی کا یہ قول ثابت ہوتا ہے کہ:

> ''شفق سوپوری اپنی شعری روایت پر غیر معمولی گرفت رکھنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی اور راگ راگنیوں کے مضمرات کا گہرا شعور رکھتے ہیں''۔ ۵

شفق سوپوری کی ایک اور اہم تصنیف ''موسیقی، شاعری اور لسانیات'' ہے۔ اس کتاب کے اب تک دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جس سے اس کے موضوع کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہے۔

۱۔ موسیقی کی معنویت

۲۔ موسیقی کے عناصر ترکیبی

۳۔ موسیقی کی ابتداء

۴۔ میلوڈی اور ہارمونی

۵۔ موسیقی، جمالیات اور نفسیات

۶۔ موسیقی کی جمالیاتی قدر

۷۔ موسیقی، شاعری اور لسانیات

ان موضوعات کے تناظر میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ شفق سوپوری نہ صرف علم موسیقی سے بہرا ور ہے بلکہ جمالیات، نفسیات اور لسانیات پر بھی اُن کی گہری نظر ہے۔ چنانچہ نادر اور انوکھے موضوع پر تصنیف کی گئی یہ کتاب بقول شمس الرحمان فاروقی اس قدر مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیفی سرونجی نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب ایک مشکل موضوع پر ہے اور شعری مجموعوں کی بھیڑ میں یہ منفرد کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر شفق سوپوری کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ نیز نئی نسل میں اس موضوع پر کسی اور کی کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔۶

شفق سوپوری کی ایک اور اہم تصنیف ''مخزن موسیقی'' ہے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ مصنف کو اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا۔ اگرچہ اب تک ہندوستانی موسیقی کے نظام پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن کم از کم اردو میں کوئی ایسی تصنیف نظر سے نہیں گذرتی جس میں ہندوستانی موسیقی کے ساتھ ساتھ مغربی، عربی اور ایرانی موسیقی کے نظام پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اور ان کے بیچ انسلاکات پر گفتگو کی گئی ہو۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ موسیقی کی معنویت

۲۔ ہندوستانی موسیقی

۳۔ مغربی، عربی اور ایرانی موسیقی

چونکہ شفق سوپوری کو اللہ تعالیٰ نے لحنِ داؤدی عطا کیا ہے اور اُنہیں موسیقی سے گہری دلچسپی

اور وابستگی ہے اس لیے انہوں نے کئی برس تک باضابطہ طور پر ہندوستانی موسیقی کی تربیت حاصل کی اور اسکے رموز و اسرار کے ساتھ ساتھ اس کی فنی نزاکتوں کا مطالعہ نہایت گہرائی سے کیا، وہ خود کہتے ہیں:

''ہر چند کہ میرے بعض احباب مصر تھے کہ میں موسیقی کی عملی تعلیم جاری رکھ کر موسیقار یا گلوکار بن جاؤں۔ مگر اس راہ میں میری شاعری سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی۔ مجھے اس بات کا زبردست احساس ہے کہ ہر فن ہمہ وقت توجہ اور ارتکاز کا تقاضا کرتا ہے جس کے بغیر کسی فن میں تکملیت کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا اپنے کیریئر کے ایک خاص موڑ پر میں نے فنِ شاعری کو گلے سے لگایا۔ اس عمل سے موسیقی سے میرے شغف پر کچھ اتنا زیادہ اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ میں نے ''اردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے اثرات'' کے موضوع پر مقالہ تحریر کر کے کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ موسیقی سے میری اس وابستگی کا نتیجہ ہے کہ میں یہ کتاب تحریر کر سکا''۔ ۷

شفق سوپوری کی تصنیف ''کلام فیض کا عروضی مطالعہ'' بھی موضوع کے اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اگرچہ اب تک فیض کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اُن کے کلام کا عروضی مطالعہ پہلی بار شفق سوپوری نے کیا ہے۔ شفق سوپوری نے ایک مشکل موضوع کو چھیڑا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ یوں بیان کرتے ہیں:

''موسیقی سے میرے فطری لگاؤ نے مجھے فن موسیقی کے بڑے اساتذہ کو چھوڑ کر جن عظیم فنکاروں کے قریب کر دیا اُن میں فیض احمد فیض بھی شامل ہیں۔ پندرہ بیس سال کی عمر میں مجھے فیض صاحب کا وہ سارا کلام ازبر تھا جو اُس وقت تک موسیقی سے آراستہ ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ جب مجھ پر شاعری اور موسیقی کے گہرے رشتے کے رموز منکشف ہو گئے، میں کلام فیض سے زیادہ لطف اندوز ہونے لگا۔ میں فیض صاحب کی فنکارانہ عظمت اس لیے بھی مسلم تصور کرتا ہوں کیونکہ انہیں اوزان و بحور اور الفاظ کی غنائیت کا علم ودیعت ہوا تھا''۔ ۸

اس کتاب میں شفق سوپوری نے فیض احمد فیض کے پورے کلیات کا عروضی مطالعہ کیا ہے۔ جس سے اُن اوزان کی نشاندہی ممکن ہوسکتی ہے جو فیض نے استعمال کئے ہیں۔ انہوں نے فیض کے ہر مجموعے کلام کی تفصیل دے کر اُن اوزان کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جن پر فیض کا عروضی نظام قائم ہے۔ ہر مجموعے کلام میں اپنے جائزے کے دوران شفق سوپوری نے غزلوں، نظموں اور دوسری منظومات کو الگ الگ زمروں میں رکھا ہے۔ اس کے علاوہ فیض کی جن نظموں کو مشہور و معروف گلوکاروں نے سُروں سے سجا کر لافانی بنا دیا ہے اُن کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں جناب رفیق رازیوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''کلام فیض کا عروضی مطالعہ پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شفق نہ صرف فن شاعری اور فن موسیقی کے رموز سے کمال درجہ

واقفیت رکھتے ہیں بلکہ علم عروض پر بھی انہیں غیر معمولی دسترس

ہے''۔۹

شفق سوپوری کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک اور کتاب ''جہات'' ہے۔اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ بیتاب کی نظموں میں پیکر تراشی

۲۔ رفیق راز کی متصوفانہ فکر

۳۔ ہمدم کاشمیری کا شہر غزل

۴۔ بیسوی صدی کے اردو ادب میں انگریزی کے رجحانات (پروفیسر ظہور الدین کی خیال انگیز تصنیف)

۵۔ جموں وکشمیر کے اردو شاعروں کے نظموں میں یکجہتی کا پیغام

۶۔ بیتاب کی نظموں میں علامت نگاری

۷۔ شیرازہ اردو کا پچاس سالہ سفر

۸۔ کلام غالب میں تفہیم غالبؔ

جیسا کہ ان عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کا تعلق جموں وکشمیر کے ادبی منظرنامے سے ہے۔جس کی وجہ ڈاکٹر شفق سوپوری یہ بتاتے ہیں کہ موجودہ صورتحال کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری نسل اپنا نقاد خود پیدا کرے۔ چنانچہ شفق سوپوری نے اس ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے ریاست کے نمائندہ شعراء کے کلام کو صحیح تناظر میں پرکھنے کا بھیڑہ اٹھایا ہے۔اس مجموعے میں شامل ہمدم کاشمیری، رفیق راز اور پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری پر لکھے گئے

مضامین اس سلسلے کا آغاز تصور کئے جا سکتے ہیں۔

بیتاب کی نظموں میں پیکر تراشی پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شفق سوپوری شاعری میں پیکر تراشی کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور پیکر تراشی کے لیے جس لسانی اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُسے بخوبی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اس مضمون میں اپنے ایک اہم معاصر پرتپال سنگھ بیتاب کی نظموں میں پیکر تراشی کی خصوصیات کی نشاندہی کر کے اسے بیتاب کی ایک ممتاز فنی خوبی سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح ''رفیق راز کی متصوفانہ فکر'' پڑھ کر اندازہ ہوجاتا ہے کہ شفق سوپوری نے کشمیر کی منفرد صوفیانہ روایت کو نہ صرف سمجھا ہے بلکہ وہ اس کے اسرار و رموز پر بھی بحث کر سکتے ہیں۔ ''ہمدم کاشمیری کے شہر غزل'' میں شفق سوپوری نے ہمدم کے منفرد شعری مزاج کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب میں شامل ایک اور اہم مضمون ''بیتاب کی نظموں میں علامت نگاری'' ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شفق سوپوری علامت نگاری برتنے کے فن سے بھی واقف ہیں۔ ''کلامِ غالب میں تفہیم غالب'' بھی اپنی نوعیت کے انفرادی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ ''شیرازہ اُردو کا پچاس سالہ سفر'' تحقیقی نوعیت کا۔

مجموعی طور پر یہ کتاب پڑھنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شفق سوپوری میں تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتیں بدرۂ اتم موجود ہیں اور وہ شعر کی تشریح اور تفہیم کے سلسلے میں اپنی تمام علمی صلاحیتوں کو دلائل کے ساتھ بروئے کار لائے ہیں۔

''غ۔م۔طاؤس: فن اور شخصیت'' تحقیقی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے شفق سوپوری کی تحقیقی صلاحیت پوری طرح سے ظاہر ہوتی ہے۔ شفق سوپوری لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف نے اُستاذ مکرم قبلہ پروفیسر حامدی کاشمیری کی
> ہدایت پر گذشتہ صدی کے آٹھویں دہائی میں کشمیر کے ایسے

مشاہیر ادب پر تحقیقی مقالے لکھنے کا بھیڑہ اٹھایا تھا جنہوں نے اپنی آنے والی نسلوں کو متاثر کیا۔ ان میں چند ایسی شخصیات ہیں جن کے کارنامے وقت کی گرد میں گم ہو چکے ہیں۔ ایسی شخصیات کے ادبی کارناموں کو صحیح تناظر میں منظر عام پر لانے کا فرض محسوس کرتے ہوئے میں نے پہلا مقالہ طاؤس پر لکھا اور ارادہ یہی ہے کہ اس خوشگوار فریضے کو آئندہ بھی ادا کرنے کی مقدور بھر مساعی کروں گا''۔۱۰

یہ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ طاؤس کے حالات زندگی

۲۔ طاؤس کی شاعرانہ اہمیت

۳۔ کشمیر میں اردو نثر کی اہمیت اور طاؤس کے نثری کارنامے

۴۔ طاؤس کی ادبی اہمیت

شفق سوپوری نے طاؤس کے عہد اور ان کی شاعرانہ شخصیت اُن کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر پر مختصر مگر مدلل بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں طاؤس کے چند نمایاں معاصرین جن میں غلام رسول نازکی، شہہ زور کاشمیری، پنڈت نند لال کول طالب، تنہا انصاری اور رسا جاودانی کے شعری امتیازات پر بحث کرتے ہوئے طاؤس کے عہد کے پورے ادبی منظر نامے کی ایک دستاویز پیش کی ہے۔ اسی انداز میں انہوں نے طاؤس کی نثری خدمات بیان کرتے ہوئے اُن کے معاصرین کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان سب خصوصیات کی بنا پر اس کتاب کو کشمیر کے ادبی منظر نامے میں ایک بہت اہم حیثیت حاصل ہے۔

شفیق سوپوری صرف ایک شاعر، نقّاد، محقق، ڈرامہ نگار، کالم نویس ہی نہیں بلکہ ایک طنز و مزاح نگار اور فکشن نگار کے طور پر بھی انہوں نے اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کے مزاحیہ کالموں پر مبنی کتاب ''شگفتانے'' اگرچہ ابھی زیر اشاعت ہے تاہم اس کتاب کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شفیق سوپوری طنز و مزاح کے فن سے پوری طرح واقف ہیں اور اس فن کے نازک لوازمات برتنے کی ان میں کمال درجہ ہنر موجود ہے۔

شفیق سوپوری نے حال ہی میں ایک ناول ''نیلیما'' تصنیف کی ہے۔ یہ ناول آدی واسی سماج پر مبنی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس ناول کو اُردو کا پہلا ناول قرار دیا جا سکتا ہے جس میں آدی واسی عورتوں کے جنسی استحصال کو آدی واسی معاشرے کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں جو زبان شفیق سوپوری نے استعمال کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا پلاٹ، کردار، قصہ، مکالمے، منظر نگاری میں اچھا تال میل ہے اور اس کا امتیاز اختصار ہے جس کے لیے شفیق سوپوری نے نہایت سخت محنت کی ہے۔

حواشی

۱: نیلیما، شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ سروس دہلی، ۲۰۱۶ء صفحہ ۱۱

۲: دل خاک بسر: شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۹ء

۳: اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی: شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۱ء، صفحہ ۸

۴: ایضاً: صفحہ ۱۲

۵: ایضاً

۶: موسیقی، شاعری اور لسانیات: ڈاکٹر شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۲ء

۷: مخزن موسیقی، ڈاکٹر شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۲ء، صفحہ ۸۔۹

۸: کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ، ڈاکٹر شفق سوپوری، ۲۰۱۲ء، صفحہ ۹

۹: ایضاً، صفحہ ۷

۱۰: غ۔م۔طاؤس: فن اور شخصیت: شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۲ء، صفحہ ۴

باب سوم

جموں و کشمیر میں اُردو غزل کی روایت

- ریاست جموں وکشمیر قدیم عہد سے ہی تہذیب وتمدن رسم ورواج علم وفضل زبان وادب شعروحکمت میں تابناک رہا ہے چاہے زمانہ قدیم ہو جب کشمیر میں سنسکرت کا بول بالا تھا یا چودھویں صدی کے بعد کا زمانہ، جب مسلمان وارد کشمیر ہوئے اور عملداری سلسلے کے نتیجے میں فارسی زبان کو درباری درجہ ملا، یا مہاراجوں کا دور ہو جہاں سے اردو کو سرکاری زبان بننے کا موقعہ ملا۔ یہ امر بہرِ کیف قابلِ غور ہے کہ اس سے پہلے بھی یہاں اردو زبان کے آثار ملتے ہیں۔ ۱۸۶۲ء میں طبقات الارض کے ماہر فریڈرک ڈریو نے ریاست میں اردو کی مقبولیت کے بارے میں لکھا ہے:

''ہندوستان سے آنے والے ملازم لوگ، بلاشبہ ہندوستانی
(اردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں''۔۱

زبانوں کی تشکیل میں شاعری کا ہاتھ ہمیشہ رہا ہے اور دیگر ادبی مراکز کی طرح ریاست میں بھی اردو ادب کا آغاز شاعری سے ہوا ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرید پربتی لکھتے ہیں:

''جموں وکشمیر میں اردو شاعری (غزل) کے باضابطہ آثار
تقریباً اس وقت سے ہی مل رہے ہیں جس وقت سے شمالی ہند
میں اردو شاعری کے آثار ملتے ہیں''۔۲

کشمیر میں اردو غزل گوئی کا باضابطہ آغاز کب اور کس کے ہاتھوں ہوا، یہ مسئلہ متنازیہ فیہ رہا ہے کیونکہ اس سے پہلے یہاں فارسی کی روایات تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جاوید راہی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''کشمیر میں اردو کے ابتداء شعراء میں ظفر خان احسن بھی شامل

تھا۔ یہ ۱۶۳۳ء سے ۱۶۶۷ء تک دو بار کشمیر کا ناظم رہا۔ اسی دور میں اردو میں لکھنے والوں میں ملا محمد خان بھی تھا۔ یہ وہ عہد تھا جب فارسی شاعری کی زبان تھی اور اردو میں محض تفریح طبع کی خاطر ہی شعر کہے جا رہے تھے، مرزا دار جوتا، جوغنی کاشمیری کے معاصر تھے، فارسی میں شاعری کرتے تھے مگر کبھی کبھی اردو شعر بھی کہتے تھے''۔ ۳

بعض روایات کے مطابق کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں اردو غزل کا آغاز میر کمال الدین حسین اندرابی رسوؔا سے ہوتا ہے۔ عبدالقادر سروری اس بارے میں لکھتے ہیں:

''میر کمال الدین حسین اندرابی رسوؔا سے کشمیر میں اردو کے ترقی یافتہ روپ کا آغاز ہوتا ہے۔ رسوؔا اورنگ زیب کے آخری عہد کے کشمیری انشا پردازوں اور شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ کم وبیش شمالی ہند کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں جعفر زٹلی، افضل، فضلی کے معاصر تھے''۔ ۴

رسوا کی شاعری میں قدیم شعراء کا رنگ ملتا ہے۔ ان کا انداز بقولِ عبدالقادر سروری:

''بعض معاصرین دہلی اور اورنگ آباد، خاص طور پر بعد کے شعراء جیسے یک رنگ، ناجی وغیرہ سے ملتا ہے''۔ ۵

رسوا نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ ان کی غزلوں میں دکنی الفاظ کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

باغیر الفت تا کجا از یار وحشت تا بکے

سب سوں وفا ہم سوں جفا اے بے وفا کیا ڈھنگ ہے

تاریخی حیثیت سے عبدالغنی بیگ نے کشمیر میں اردو غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں قابل قدر مقام حاصل کیا ہے۔ عبدالغنی کی زبان نکھری ہوئی ہے۔ آپ نے غزل میں حدیث دل کو روا رکھا، ایک شعر نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو:

دل یوں خیال زلف میں بھرتا ہے نعرہ زن

تاریک شب میں جیسے کوئی پاسبان پھرے

اس تعلق سے ڈاکٹر فرید پربتی نے عبدالغنی بیگ کے بارے میں لکھا ہے:

''اردو ادب کے قدیم تذکروں میں مثلاً نکات الشعراء، تذکرہ ہندی وغیرہ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہ حضرت جانِ جاناں، مظہر اور ظہور الدین شاہ حاتم کے ہم عصر تھے اور ایہام گو شعراء میں شامل تھے''۔ ۶

عبدالغنی کے فرزند مرزا گرامی اردو فارسی کے زبردست شاعر تھے جو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غزل میں ان کا خاصا رنگ رہا ہے۔ فارسی تراکیب کا استعمال خوب ملتا ہے۔ فرید پربتی لکھتے ہیں:

''میر تقی میر اور قائم نے ان کا تذکرہ طبقہ دوم کے شعراء میں کیا ہے''۔ ۷

ریاست میں اس کے بعد کا دور اردو شعر و ادب کا عہدِ زرین کہلاتا ہے۔ اس میں کشمیری پنڈت شعراء برسرِ اقتدار آئے۔ اس دور میں بہت اچھے سخنور گذرے جنہوں نے مجموعی طور

پر اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کے گیسو سنوارے۔اس ضمن میں پنڈت دیا رام کاچرو خوشدلؔ (ولادت ۱۷۴۴ء سرینگر) سرفہرست ہے۔خوشدلؔ کے بارے میں فرید پربتی لکھتے ہیں:

''.....وہ فارسی کے اہم شاعر اور انشا پرداز تھے۔اس کے باوجود انہوں نے اردو میں موتی جیسا شعر کہا ہے''۔۸

خود فنا ہو کے ذات سوں ملنا
یہ تماشا حباب میں دیکھا
آپ کوں سوز اور کوں لذت
یہ صفت کوں کباب میں دیکھا

مرزا جان بیگ سامی اس دور کے اہم شاعر ہیں۔ان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر جاوید راہی اپنی کتاب ''جموں کشمیر کے قبائل اور ان کی زبان'' میں لکھتے ہیں:

''ان کا اصل مطالعہ اگرچہ فارسی میں تھا مگر ان کے اردو اشعار آسان اور میٹھی زبان میں ملتے ہیں''۔۹

افسوس کہ اغیار ہوئے یار تمہارے
غماز بنے محرمِ اسرار تمہارے
ہم گھر میں تمہارے کہو کس راہ سے پہنچیں
دشمن ہیں ہمارے در و دیوار تمہارے

سکھوں کے دور حکومت میں کشمیر کے لوگ زبردست افراتفری، ظلم و جبر اور بربریت

کے شکار ہوئے۔لوگوں کو بے شمار مصائب ومشکلات سے دو چار ہونا پڑا۔اور کسی حد تک ادبی کاموں میں جمود چھا گیا لیکن باوجود اس کے ادب کے پرستار اس کی آبیاری کرتے رہے۔ اس دور میں جن شعراء نے غزل کی طرف توجہ دی ان میں بقولِ ڈاکٹر جاوید راہی:

''مہتاب رائےؔ نائب، گنگا داس تسکینؔ، اجودھیا پرشاد حیرتؔ اور غلام ناصر چراغؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں''۔۱۰

سکھوں کے بعد ڈوگرہ راج کی ابتداء ہوتی ہے۔اسی دور میں ''ودیا پرکاش'' پریس قائم کیا گیا۔اس حکومت کے راجا مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔اس پر بحث کرتے ہوئے فرید پربتی لکھتے ہیں:

''مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دور اردو شاعری کے حوالے سے کافی اہم دور ہے۔پیرزادہ محمد حسین عارف، منشی امیر الدین امیر، سالک رام سالک، ہرگوپال خستہ اس دور کے قابلِ ذکر شعراء ہے۔ان شعراء نے جملہ اصناف اور ہیتوں میں طبع آزمائی کی ہے.....ان کے یہاں زبان و بیان کی لطافت، احساس کی تازگی اور ہیتی تجربات بھی نظر آتے ہیں۔ان شعراء کی وساطت سے یہاں پر آزادؔ اور حالیؔ کے اصلاحی رجحانات بھی اردو شاعری میں داخل ہو گئے۔البتہ شبلیؔ اور اقبالؔ کا یہاں کے بیشتر شعراء پر اثرات زیادہ حاوی نظر آتے ہیں''۔۱۱

ہرگوپال خستہ اس دور کے اہم شاعر اور نثر نگار تھے۔انہوں نے غزل، مثنوی، نظم، رباعی، قصیدہ، مرثیہ جیسی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی لیکن غزل میں وہ قدرت رکھتے تھے۔ان کے

کلام میں شیرینی اور روانی ملتی ہے۔کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

خوب ڈھونڈھا جہاں میں اے خستہ
خستگی کا نہ آشنا دیکھا

کیا بتائیں جہاں میں کیا دیکھا
ہر طرف جلوۂ خدا دیکھا

کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم
دم کو ہر دم گیا ہوا دیکھا

سالک رام سالک کا نام بھی اس ضمن میں لائق توجہ ہے۔فرید پربتی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدہ،نظم اور گیت کے نمونے موجود ہیں۔ان کے یہاں نئے موضوعات اور لطفِ زبان کے علاوہ فنی رچاؤ اور فکری ارتکاز بھی ہے''۔ ۱۲

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

گرداب محبت سے ہوا کوئی نہ جاں بر
یہ بحر وہ ہے جس کا کنارا نہیں ہوتا

اس عہد کے دوسرے غزل گو شعراء میں احسن ابن علی مولوی محمد عبداللہ وکیل، قاضی عبداللہ منظور، چودھری خوشی محمد ناظر، جسٹس شاہ دین ہمایوں، منشی غلام محمد صادق، منشی غلام محمد خادم،

مولانا عبدالقدیر، ضیاالدین ضیا، عاجز صبا، گنجو محمد الدین فوق، بسمل مرزا مبارک، تیج غلام حیدر خان چشتی، پیرزادہ غلام محمد مہجور، ناز سوشیلا تکو، بشیر ناتھ رینہ، آنند لال رتن، سعد الدین چستی، اسد میر اور نیاز کشمیری قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو شعر وادب کی بھرپور پذیرائی ہوئی اور ریاست میں کل ہند مشاعرے منعقد ہونے لگے گویا کہ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں نے اردو شعر وادب کو فروغ دینے کا ایک محاذ کھڑا کیا۔ اس عہد پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو علمی وادبی اور افادی اہمیت کے مدنظر اسے ذریعے تعلیم اور ادبی اظہار کا وسیع موقف حاصل ہو چکا تھا۔ اور یہ دفتروں، عدالتوں اور دربار کی زبان بن گئی تھی۔ اس زمانے میں کشمیری ادیبوں کے بیرون ریاست کے ادیبوں کے روابط بڑھنے لگے اور بعض چوٹی کے ادیب کشمیر میں آنے جانے لگے''۔ ۱۳

اس طرح ریاست میں شعر وادب کی ترقی میں مزید وسعت ہوئی یہاں تک کہ ملک گیر منظر نامے پر رونما ہونے والی ادبی وغیر ادبی تحریکوں کا اثر ریاستی ادبی منظر نامے پر بہت حد تک ہونے لگا۔ اس ضمن میں خاص طور پر ترقی پسند تحریک کا بھرپور اثر مختلف شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔ اس میں پردیسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''پچھلے عہد میں ادب کی راہیں روایتی تھیں اور دوسری

تحریروں کی تحرک ضرورت، لیکن اس دور میں ادب کی راہیں زندگی سے کھولنے کی کوشش شروع ہوئی اور اسے انفرادی اور اجتماعی اور سماجی تقاضوں کا آئینہ دار بنانے کی کوشش کی جانے لگی۔ گو روایت کا پاس اب بھی باقی ہے۔ نئے شعور کا آغاز پردیسی سے ہو چکا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں ان کی ہم خیال دوستوں نے ترقی پسند ادیبوں کی لیگ قائم کی تھی''۔ ۱۴

پردیسی کے ہمنواؤں میں ویشنور، دینا ناتھ، وارکو شاہد، زتشی، میر غلام حسن، تیرتھ کاشمیری، بے غرض، پرتھوی ناتھ کول اور نند لال واتل قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بعد ریاست میں ایک اور ادبی رجحان یعنی حلقہ ارباب ذوق کا آغاز ہوا۔ اس حوالے سے سروری لکھتے ہیں:

''یہ شعراء بالعموم تقسیم وطن سے پہلے کے اہم شعری رجحانات مثلاً وطنیت، حسن و عشق، منظر نگاری، آزادی اور سماجیات کا اظہار کرتے رہے ان میں سے کئی شعراء کے شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان میں غلام حسین تنہا کا ''شبستان''، غلام رسول نازکی کا ''دیدہ تر'' نند لال کول طالب کا ''رشحاتِ قلم''، قمر قمرازی کا ''ارمغانِ کشمیر''، کشن سمبل پوری کا ''فردوسِ وطن''، رسا جاودانی کا ''نیرنگِ غزل'' اور ''نظم ثریا''، منوہر لال دل کا ''نقد دل''، دینا ناتھ رفیق کا ''سنبل و ریحان''، نند لال

کول طالب بےغرض کا ''ترانہ بےغرض''، غ۔م۔طاؤس کا
''موج موج''، شیخ غلام علی بلبل کا ''خندہ گل'' قابل ذکر
ہیں''۔۱۵

اس طرح مذکورہ شعراء نے نہ صرف دیگر اصنافِ سخن میں اپنی قلم کے ہنر کو آزمایا بلکہ غزل گوئی میں بھی اپنا اپنا ایک خاص رنگ واسلوب اور مقام بنایا۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

رلایا ہے مجھے بےوفا کی یاد نے اب تک
جلایا ہے مجھے سوزِ دل ناشاد نے اب تک
ستایا ہے مجھے میرے ستم ایجاد نے اب تک

حاذقؔ

ستم نصیب بتِ طرحدار ہیں ہم لوگ
بہت اداس بہت دلفگار ہیں ہم لوگ

عشرتؔ

دامن گلستان پر ہے خزان پھر سایہ فگن اب کیا ہوگا
آغوش محسن اور سروسمن، یارانِ چمن اب کیا ہوگا

شہہ زور کاشمیری

بادہ تقدیس کے ساغر چھلکتے ہیں یہاں
گل چٹکتے ہیں یہاں بلبل چہکتے ہیں یہاں

ایضاً

کر بلبلو طاؤس کی تقلید سے توبہ

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ
زندگی میں میر ہو مجھے دل کا سکوں
موت آجائے تو مر کر نواخواں کوئی نہ ہو
غ۔م۔طاؤس

اے میری چشم گریاں شمع مزار بن جا
اے تار اشک بڑھ کر موتی کا ہار بن جا
برق جمال طور سے بے خود ہوئے کلیم
میں کھیلتا ہوں ایسے نظاروں سے رات دن
غلام نبی بلبل

نہ پوچھ ہم جیتے ہیں کیوں کر تیری دنیا میں
سسکتی زندگی ہے اور زبان خاموش ہے ساقی
تنہا انصاری

تھی مرے دل کی امنگوں ہی سے دنیا کی بہار
دل پریشان کیا ہوا، ظالم پریشان ہوگیا
فاضل کشمیری

اس کے بعد تقسیم ملک کا سانحہ پیش آیا جس نے نہ صرف سیاسی، سماجی، جغرافیائی منظر نامہ اثر انداز ہوا بلکہ دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی اس کے عمیق اثرات رونما ہوئے، اس سے قلمکار جس کرب سے گزرے اس کا اندازہ ان کی تخلیقات سے ہوتا ہے۔ جاوید راہی لکھتے ہیں:

''اس سانحہ نے قلمکاروں کو ایک نئے دکھ درد سے روشناس
کرایا چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد ایسا ادب وجود میں آیا جس
میں جدائی کا کرب، انسان کی حیوانی جبلت اور تقسیم کی
اندوہناک صورت حال کا نقشہ پیش کیا گیا تھا''۔۱۶

اس کے علاوہ غلام نبی ناظرؔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے وہ ایک سیاسی
جدوجہد اور کشمکش کا نتیجہ دکھائی ہے اور اسی دور نے سماجی اور
معاشی تعمیرِ نو کو فروغ دینے کی طرف توجہ دلائی''۔۱۷

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں اور بیاں ہے کہ تقسیمِ ملک کے بعد ریاست میں تعمیر و ترقی کا نیا دور آیا، جس نے شاعروں اور ادیبوں کو ایک منفرد پلیٹ فارم مہیا کیا۔ اس ضمن میں محکمہ اطلاعات نے ۱۹۵۶ء میں 'تعمیر' کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا۔ اس طرح ۱۹۵۸ء میں جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں ''شیرازہ اردو رسالہ'' کی اشاعت شروع ہوئی، ساتھ ساتھ ریڈیو کی نشریات، پریس کی پوری آزادی ایسے محرکات ہے جو ریاست میں ادبی نشاۃِ ثانیہ کے ضامن ہیں۔ اس دور میں جن غزل گو شعراء نے اپنا مقام بنایا ان میں چند ایک حسبِ ذیل ہیں۔

تقسیمِ ملک کے بعد قیصر قلندر کا شمار ریاست میں ایک لااُبالی غزل گو کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں فرید پربتی لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری خواب اور حقیقت کا خوبصورت سنگم ہے۔ ان
کا طبعی رجحان نغمہ خیزی اور ترنم ریزی کی طرف زیادہ

ہے''۔۱۸

نمونہ کلام:

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں احساس کے نازک سینے میں
اک حسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں

زلف کے ساتھ مہکتا رہا افسونِ غزل
شعر قیصر سے سنبھلتا ہے ہمیشہ جادو

قیصر قلندر کے ہمعصر اکبر جے پوری صاحب طرز اور قادرالکلام شاعر تھے۔انہوں نے روایتی غزل گوئی کا رنگ برتا تغزل ان کا خاص معیار ہے۔اس تعلق سے فرید پربتی، اکبر جے پوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کا زیادہ تر جھکاؤ رومانی غزلیں تخلیق کرنے کی طرف ہے''۔۱۹

نمونہ کلام:

یہ جو پتھر میرے آنگن میں گرا کرتے ہیں
میرے ہمائے مجھے یاد کیا کرتے ہیں

گد گدا کر آپ دل کو ناخنِ شمشیر سے
ہر دہانِ زخم کا پھر مسکرانا دیکھیے

اکبر جے پوری کی ہمیشرہ شہزادی کلثوم بھی وادی کے غزل گو شعراء میں اہم مقام رکھتی

ہے۔ان کے حوالے سے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''شہزادی کلثوم نے شعر میں ایک اچھا معیار حاصل کرلیا تھا۔
ان کی غزل میں رومانیت برائے نام ہے بلکہ وہ عشق ومحبت
کے جذبات کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کرتی ہے''۔۲۰

نمونہ کلام:

جب اہل دل گر عشق کا عرفان ہوگیا
حسنِ فریب کار پشیمان ہوگیا
اقتدارِ عشق کا جب مجھ کو عرفان ہوگیا
جلوۂ حسنِ ازل محشرِ بد اماں ہوگیا

اس کے علاوہ شوریدہ کاشمیری تقسیمِ ملک کے بعد ریاست کے برگزیدہ شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔فرید پربتی ان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''شوریدہ کاشمیری کی شاعری کلاسیکی روایات کی پاسداری
کے ساتھ ساتھ عصری حسیت سے بھی متصف ہے''۔۲۱

لگ بھگ ۱۹۶۰ء میں ایک طویل کشمکش کے بعد اُردو غزل کو ایک نیا لب ولہجہ حاصل ہوا۔ اس دوران میں ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت وغیر تحریکات اور بعض رجحانات نے کسی حد تک غزل کو پس منظر میں ڈال دیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کا سانحہ، فسادات کے نتیجے میں ہولناک وارداتیں اور دیگر کئی عوامل ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے ادب پر سکوت طاری رہا، جسے عام طور پر ادبی جمود سے تعبیر کیا گیا۔ یہاں تک کہ محمد حسن عسکری نے ادب کی موت کا اعلان کردیا۔ بہرحال نئی غزل کے لیے اس عرصے

میں راہیں ہموار ہو رہی تھیں، اس کے لب ولہجہ کے خدوخال مرتب ہو رہے تھے، تاوقتیکہ ناصر کاظمیؔ، احمد مشتاق، منیر نیازی، ظفر اقبال وغیرہ کی صورت میں اسے اہم معمار نصیب ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب غزل کا سکّہ مشکل سے چلتا تھا اور دو یا تین شعراء کو چھوڑ کر غزل گو شعراء عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں ناکام تھے۔ دراصل بقول ناصر کاظمی لوگ غزل سے نہیں، غزل کے روایتی کلیشے کے مخالف تھے۔ لہٰذا شاعروں سے کوئی نئی بات کہنے کا تقاضا ہو رہا تھا۔ نئی غزل کے معماروں کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے موضوعات اور لب ولہجہ دونوں کو جدید تقاضوں سے ہمکنار کر کے اسے پھر سے عوامی ذوق کے مطابق بنا دیا۔ ناصر کاظمی نے اُردو غزل کو نرم اور منفعل لہجہ عطا کیا جسے عام طور پر لہجۂ میر کی تجدید یا توسیع کا نام دیا جاتا ہے۔ احمد مشتاق کے یہاں غالبؔ کے آہنگ کی گونج زندہ ہوگئی۔ منیر نیازیؔ نے علامتی معنویتوں سے ایک اسراری کیفیت کی بنیاد ڈال دی اور ظفر اقبالؔ نے زبان کے ساتھ نئے تجربے کئے۔ جدید غزل کو غیر منفعل اور جارحانہ لہجے کی دین دراصل ظفر اقبال ہی کا کارنامہ ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو شاعری کے حوالے سے مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد کافی اہم ہے۔ اُردو شاعری کی بنیادوں کو مستحکم بنانے کے سلسلے میں اس دور کے جو مشاہیر قابل ذکر ہیں ان میں پیرزادہ حسین عارف، منشی امیر الدین امیر، سالک رام سالک اور ہرگوپال خستہ کے نام اہم ہیں۔ بعد کے جن شعراء نے اس روایت کو مستحکم بنانے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ان میں خصوصیت کے ساتھ منشی سراج الدین، مرزا اسداللہ سعدؔ، خوشی محمد ناظر، نندلال کول طالب، رسا جاودانی، مرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکیؔ، شہہ زور کاشمیری، قیصر قلندر، عابد مناوری، قاضی غلام محمد، ودیارتن عاصی، سلطان الحق شہیدی کے علاوہ تنہا انصاری، غ۔م۔ طاؤس، سیفی سوپوری، اکبر جے پوری، اندرجیت لطف، عرش

صہبائی، قمرالدین قمر اور نیاز کامراجی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ شعراء کے اس قبیلے میں چند نام ایسے ہیں جو کشمیر میں نہ صرف اُردو غزل کی روایت کے مجدد کہلائے جاسکتے ہیں بلکہ انہوں نے اپنی تخلیقی کاشوں سے اُردو ادب کے اعلیٰ حلقوں میں اپنی شناخت بھی قائم کی۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر اس دور میں میر غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، شہزور کاشمیری، قیصر قلندر، نند لال کول طالب اور رسا جاودانی جیسے رجحان ساز شاعر پیدا نہ ہوتے تو ریاست میں اردو شاعری کے معیار کو اعلیٰ بنانے کا کارنامہ کئی نسلوں تک پس پشت پڑ جاتا۔

وادیٔ کشمیر میں خوش قسمتی سے نئی غزل کے رجحانات کو رائج کرنے کے لیے جو شاعر ۱۹۶۰ء کے بعد سامنے آئے انہوں نے اپنے لسانی شعور اور تخلیقی تابنا کی سے غزل کے چراغ کو نئے تقاضوں کی تیز ہواؤں میں فروزاں رکھنے کے سلسلے میں نہایت اہم کارنامہ انجام دیا۔ ان میں حامدی کاشمیری، حکیم منظور، ہمدم کاشمیری، مظفر ایرج اور شبیب رضوی اہم ہیں جن کے کلام میں ناصر کاظمی کے نرم اور منفعل لہجے کی گونج، احمد مشتاق کے آہنگ غالب کی بازگشت، منیر نیازی کی علامتی معنویت سے عبارت اسراری کیفیت کا آہنگ اور ظفر اقبال کے لسانی تجربوں اور جارحانہ لہجے کی پرچھائیاں بولتی نظر آتی ہیں۔

حامدی کاشمیری کا تعلق جدیدیت کے دور سے ہے۔ اُن کی غزلوں کا لہجہ نرم اور پر اثر ہے۔ وہ حال کا رشتہ ماضی سے استوار کرنے کی تخلیقی کاوش بڑے خلوص سے کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کے یہاں بھی اسراری کیفیت علامتی سطح پر نمو پذیر ہوتی ہے، مگر یہ کیفیت معنوی سطح پر روایتوں کی گمشدگی پر احساس زیاں کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ حامدی کا نادیدہ جہاں دراصل ان کی وہ خواب بستیاں ہیں جن میں ان کا لاشعور سانس لے رہا ہے۔ ایک طرح سے ان کی شاعری پر ماضی پرستی کی دھندلی پرچھائیاں چھائی ہوئی نظر آتی ہیں مگر ہر پرچھائیں

کے پیچھے امید کا ایک تابناک سورج اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے۔ حامدی کاشمیری اپنی علامتوں سے ایک ایسی اسراری کائنات کی تخلیق کرتے ہیں جہاں ہر دروازے کے پیچھے جہانِ طلسمات چھپا ہوا ہے۔ وہ اپنے تراشے ہوئے پیکروں سے قاری کو بیداری اور نیم بیداری کے درمیان سفر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

قدم بڑھائیں تو آگے ہے آتشِ سیّال
سیاہ برف کا جنگل عقب میں میرے ہے

دشت ظلمت میں اُگا کر انجم
خواب نادیدہ کی تکمیل کروں
(شاخِ زعفران)

دشتِ بے برگ کی مانند ہوا ساکت ہے
کون یہ کوچۂ خوشبوئے حنا لے آئی

لگ گئی آگ چاند تاروں کو
اب کہاں کوئی خواب اُترے گا
وادیٔ امکاں

حکیم منظور کے اسلوبِ بیان میں باآنی کے لب ولہجہ کا شائبہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک امتیازی پہلو مقامی رنگ وآہنگ ہے۔ منظور کی دقت یہ ہے کہ انہوں نے تخلیقی

سطح پر کئی ایک سے اکتساب تو کیا ہے مگر احتساب کی توفیق سے وہ عمر بھر محروم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حقیقی شاعرانہ شخصیت کثرتِ کلام کے ملبے تلے دبی ہوئی ہے۔ بہرحال وہ ایک سلیقہ منداور صاحب طرزِ شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں عصری حسّیت کا غیر معمولی غلبہ ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں کچھ ایسے الفاظ کا استعمال ہوا ہے جو کشمیری مزاج، کشمیر کی تاریخ، ثقافت، آب وہوا اور حسن و جمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر جگہوں پر یہ الفاظ علامتی حیثیت سے خالی نظر آتے ہیں، لگتا ہے شاعر الفاظ کی سطحی چمک دمک سے قاری پر فوری اثرات مرتب کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری کا کینواس کافی وسیع ہے جہاں تخیل کی کارفرمائی بھی ہے اور پیکروں کی فراوانی بھی۔ ان کی شاعری میں کشمیری قوم کے تئیں دردمندی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ اسی کیفیت کی بناء پر ان کے اشعار میں سوز وگداز کا وصف پیدا ہوگیا ہے۔

برف شگوفے جب کھلتے ہیں، اُس موسم میں آؤ تو
میرے خطوں کی خوشبوؤں کا ہوگا کچھ اندازسا

ہوئی ہے تہذیب میری جن سے عجب نظر ساز تھے وہ موسم
چنار خوشبی کا ہی نہ کیوں ہو، مجھے کبھی خوش دھواں نہ آئے
(صبح، شفق، تلاوت)

موسموں کا اس میں کچھ حصہ نہیں معلوم ہے
پیڑ میرے بے ثمر رہ جائیں، سازش کس نے کی

پیڑ ہے سرسبز لیکن کچھ ہوا ہے جس کے سبب
فاختہ کوئی بھی ان الحراف میں آئی نہیں
(سخن، برف زار)

ہمدم کاشمیری کا لہجہ سلجھا ہوا ہے۔ اُن کے اشعار میں لفظ و معنی کے باہمی اشتراک سے ایک ایسا آہنگ تخلیق ہوتا ہے جسے ان کے اظہارِ ذات کے زیر و بم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہمدمؔ نے جو الفاظ، استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں ان کی تلازمیں اور ایمائی حیثیت ایک ایسے جدید لب و لہجے کا پتہ دیتی ہے جو تربیت یافتہ بھی ہے سلیقہ مند بھی اور باثروت بھی۔ ہمدم کی شاعری تفکر اور تاثر دونوں خصوصیات سے مملو ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے المیہ احساسات کو اشعار میں مجسم کرنے کے لیے جن پیکروں کی تخلیق کی ہے اُن سے شہنائی، مایوسی، حزن و ملال، بے یقینی، لاحاصل اور عدم تحفظ کے انکشاف کے کئی رنگ سامنے آجاتے ہیں۔ بدقسمتی سے شہرِ سخن سے ان کی طویل جلاوطنی نے انہیں کافی نقصان پہنچایا ؎

صبح ہوں شام ہوں نہیں معلوم
رات اور دن کے درمیان میں ہوں

دھواں بھی نہ اُٹھا میری آگ سے
کوئی عیب میرے ہنر میں نہ تھا
(دھوپ لہو کی)

ساحل پہ سر کو پھوڑ کے واپس نکل گیا

پہلا سا زور اب کفِ سیلاب میں نہ تھا

ہر طرف آگ کے شعلے ہیں رواں
کیا کہوں کون سا گھر میرا ہے

مظفر ایرج کو اپنا لہجہ تراشنے کے سلسلے میں مشقِ سخن کے ایک طویل سفر سے گزرنا پڑا ہے۔ان کا لہجہ اگرچہ کہیں کہیں بانی سے متاثر نظر آتا ہے لیکن اُن کے الفاظ، استعاروں اور علامتوں کی معنوی جہت ان کو منفرد شاعر بنا دیتی ہے۔انہوں نے غزلوں میں لسانی سطح پر کئی تجربے کئے ہیں۔اُن کے اشعار میں نامانوس الفاظ بھی نظر آتے ہیں مگر وہ لفظ و معنی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔اُن کے اشعار کا دھیما لہجہ، سوز و گداز اور ایک طرح کی متصوفانہ زیریں لہر انہیں ممتاز بنا دیتی ہے۔

شام پرندہ پر پھیلائے بڑی محبت سے کہتا ہے
رات سے پہلے گھر آجانا، دیر نہ کرنا
(ثبات)

میں بھول جاؤں گا اُس کو لکھا ہے جیوتش میں
یہ آدھا سچ بھی لگا ہے اگر مگر جیسا

ایک ہی سوداگر منڈی میں ہاتھ آیا
وہ بھی کباڑی! کرتار دلّی کا سودا

(دل کتاب)

پریم سنگھاسن پر بھی بٹھا لینا ہی اگر
چیسٹٹی کی بیلٹ سے اس نے پہنی ہو

(ہوادشت دیار)

فاروق نازکی ایک نہایت ہی دانشمند شاعر ہیں۔اُن کی شاعری میں دانش کی لہریں اُچھل اُچھل کر قاری کے ذہن ودل کو کئی سطحوں پر مرتعش کر دیتی ہیں۔سیدھے سادے لہجے کا یہ شاعر سہلِ ممتنع کا فن بخوبی جانتا ہے۔فاروق نازکی روایت کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے بدلتے ہوئے منظرنامے کا پورا ہوش رکھتے ہیں۔وہ اپنی شخصیت کی جزئیات اور متعلقات سے سروکار رکھتے وقت اپنی تہذیبی روایات کی جمالیات کا شعور بھی ملحوظ نظر رکھتے ہیں۔تخلیقی سطح پر ان کا معاملہ عوام سے زیادہ قریب ہے۔اس قرابت داری کو اور مستحکم بنانے کے لیے وہ متضاد کیفیتوں سے ایک ایسی حقیقت کا ظہور عمل میں لاتے ہیں جو حیرانی، استعجاب اور جمالیاتی کیف سے بیک وقت مملو ہوتی ہے۔ان کا ہر شعر ایک ماجرا ہے، ایک قصہ ہے اور کبھی کبھی ایک ذرا سی واردات ایک ایسی داستان کا رنگ اختیار کرتی ہے جس کا ہر کردار بیک وقت کہانی کے اندر بھی رہتا ہے اور باہر بھی۔فاروق نازکی کی علامتیں حیات وکائنات، انسانی رشتوں اور روح اور جسم کے کئی اسراری جہتوں کو کھول دیتی ہیں۔

کیا لذّتِ گناہ سے دل آشنا نہیں؟
شرمندہ میرے حال پہ تو ہو رہا ہے کیوں

سُنا ہے لوگ وہاں مجھ سے خار کھاتے ہیں
فسانہ عام جہاں میری بے بسی کا ہے

رہ گئے تیوری چڑھا کر، منہ سے کچھ نہ بولے
اک ذرا سی بات کو بھی مختصر کرنے لگے

خزاں آئی ہے گلشن سوکھتے ہیں
گریباں چاک ہوں اذنِ رفو دے
(لفظ لفظ نوحہ)

شبیب رضوی ایک ہنر مند سخنور ہیں۔ حال ہی میں ان کا شعری مجموعہ ''لہولہو غزل'' منظر عام پر آیا ہے۔ روایتی لب ولہجہ کے ساتھ ساتھ طنزیہ پیرائیہ شبیب رضوی کی شاعری کے دو اہم عنصر ہیں۔ کلاسیکی شعریات کے گہرے مطالعے اور زبان و بیان پر بے پناہ دسترس کی وجہ سے انہیں معنی آفرینی پر خاصی قدرت حاصل ہے۔ ان کا کوئی کوئی شعر سہل ممتنع کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ انکی شخصیت کی طرح ان کے اشعار بھی سادگی، سلاست اور خاکساری کا تاثر دیتے ہیں۔، وہ مثبت اقدار کے شاعر ہیں۔ دراصل ان کا فنی کمال ان کی رثائی شاعری میں زیادہ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ بہرحال ان کی غزلیں بندش کی چستی، اقتصادِ الفاظ، خیال آفرینی اور ردیف وقوافی کی رنگارنگی سے ایک انوکھا لطف پیدا کرتی ہیں ؎

ضد ہے اجداد کا معیار نہ گرنے پائے
ہاتھ کٹے پہ بھی تلوار نہ گرنے پائے

کمر سے تیغ اُڑا لے گیا نہ جانے کون
ہمارے ہاتھ میں بس رہ گئی سپر خالی

قصہ در درہا یوں تازہ
سوگیا زخم تو نشتر جاگا

کبوتر بن کے قاصد کس پہ اُترے
بنے ہیں شہر میں گھر ایک جیسے
(لہولہوغزل)

۱۹۸۰ء کے فوراً بعد کشمیر کے جن غزل گوشعراء نے ملکی سطح پر مقتدر نقادوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اُن میں رفیق راز سرِ فہرست ہیں۔ رفیق رازؔ کی انفرادیت کا پہلو ان کی فکر کی گہرائی اور لہجے کی ندرت میں ہے۔ رازؔ اگرچہ الفاظ کے انتخاب میں کہیں کہیں ظفر اقبال سے استفادہ کرتے ہیں لیکن ان کے لہجے میں تیکھے پن کے بجائے ایک قسم کا بانکپن دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے جو استعارے، علامتیں اور پیکر تراشے ہیں وہ ان کے عمیق مشاہدے اور وسیع تخلیقی شعور پر دلالت کرتے ہیں۔ حیرت، استعجاب اور تحقیر کا عنصر رفیق راز کی شاعری میں کئی معنوی جہتوں کو خلق کرتا ہے۔ بنیادی طور پر رازؔ کے یہاں درون کی جستجو اور اس کا انکشاف تخلیق کا مرکز بن جاتا ہے۔ اپنے باطنی کیفیات اور احساسات کے بیان کے لیے انہوں نے جو لہجہ ایجاد کیا ہے اس کے بطن سے کئی ارتعاشات جنم لیتے ہیں۔ رفیق رازؔ نے علامتوں کی

تخلیق اور غزل کے نئے معنوی نظام کو تشکیل دینے میں اہم خدمت انجام دی ہے۔انہوں نے نئے لب ولہجہ سے اسلوب کی سطح پر اپنی شناخت قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

دشتِ بدن میں شور ہے ایسا مچا ہوا
جیسے قدیم مصر کا بازار مجھ میں ہے

ہر چپ ہے تابناک ہر آواز اِک چراغ
مہکے ہے پھر بھی تیرگیٔ خطرۂ سیاہ
(انہار)

ہم اپنے اندر کی شعلگی سے رہے نمایاں
ہمیں چھپانے کی کوششیں کی تھیں ظلمتوں نے

جب آفتاب ساکھ پر ہوا تھا روشن تو
مجھے ہے یاد وہ یخ بستہ دن دسمبر کا
(مشراق)

اقبال فہیم نے ابتداء سے ہی اپنی شاعرانہ شخصیت کی شناخت کے لیے فکر اور اسلوب دونوں سطحوں پر نئے پیمانوں کی جستجو کی ہے۔انہوں نے پامال موضوعات اور لب ولہجہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے فن کو ٹھہراؤ اور یکرنگی سے بچاتے ہوئے نئے موضوعات سے اپنی شاعری

کے دامن کو وسیع کرنے کی سعی کی۔ وہ اگرچہ فلسفہ سے گہری وابستگی رکھتے ہیں مگر انہوں نے اپنے لیے وہ پیرایۂ اظہار تخلیق کیا جو پیچیدہ ہونے کے بجائے صاف، شفاف اور قابلِ فہم ہے۔ وہ شعر میں نئے تخلیقی مطالبوں کی اہمیت اور معنویت کا پورا احساس رکھتے ہیں:

ہم تو روئے تھے فہیم
دھول اٹھتی تھی مگر

پھر کسی دن ہمیں یہ ڈس لیں گے
ہم لکیروں سے پیار کرتے ہیں
(موجِ نفس)

خالد بشیر کی شاعرانہ شخصیت، مزاج اور افتادِ طبع نیز تجربات و محسوسات حقیقی ہیں۔ ان کی فکر کی جڑیں زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر انسانی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ تخلیقی شعر کے شرائط کو پورا کرنے میں وہ پورے خلوص کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے استعمال کئے ہوئے الفاظ، تراکیب، استعارے اور علامتیں زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک ایسے زیر و بم کو تخلیق کرتے ہیں جہاں معاملات زیست کی شاعرانہ اور دانشورانہ تفسیر ممکن ہو جاتی ہے۔ کاروبارِ حیات میں ان کی تنہائی کا کرب، تلاش و جستجو کی اذیت، انجانی اور انہونی وارداتوں کا خوف، اجنبی اشیاء سے متعارف ہونے کا گھناؤنا احساس، اس سب میں خالد بشیر کا خلوص، سچائی اور صداقت نظر آتی ہے ۔

کہاں پر ہو ستمبر کے مہینے
تمہاری یاد آئی جنوری میں

مری کتاب کسی نے پڑھی نہیں لیکن
زبانِ عام پر ہیں انتساب کے قصے

آہٹ بھی ہے، دروازے کی زنجیر بھی ہِلی
اور یہ بھی جانتا ہوں کہ باہر نہیں کوئی

تیری کڑوی کسیلی باتیں سب منظور مجھے
زخم پہ لگنے والا مرہم بار نہیں ہوتا
(خواب پارہ)

ایاز رسول نازکی کی شاعری رسمیہ اسالیبِ فکر اور بنے بنائے اصولوں سے انحراف کی شاعری ہے۔ بظاہر ان کی فکر سادہ لگتی ہے مگر اصل میں ان کا سادہ اسلوب اُن کی پیچیدہ خیالی کی ایسی پناہ گاہ ہے جہاں احساس فکر پر غالب ہے۔ اسی خصوصیت نے اُن کے کلام کی سادگی کو پرکاری کا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ ایازؔ اپنی شاعرانہ شخصیت کو روّیہ سازی سے بچا کر ایک ایسے اسلوب کو خلق کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جہاں احساس کے سوتے جاگتے سائے زندہ پیکروں کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ رومانیت ایازؔ کی شاعری کا اہم عنصر ہے مگر ان کی رومانیت میں نہ حسن پرستی کا غلبہ ہے اور نہ ذات کی شکستگی کا احساس۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی

فکر پر افسردگی اور اضمحلال کے سائے نظر نہیں آتے اور نہ ان کے لہجے میں جہاں بیزاری کا شائبہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ معاصر حالات کے جبر کو محسوس کرتے ہیں۔ مگر احساس کی شدتوں کو جذبات کی رو میں بہنے نہیں دیتے اور نہ لفظی تصویروں سے جادو جگانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے شعری پیکروں کو باہم آمیز کر کے شعری تجربے کی اساس معنویت اور قدر پر رکھتے ہیں:

رات چہرے کی دھوپ میں اکثر
گیسوؤں کی کتاب پڑھتا ہوں

بزرگوں نے صحرا میں دیکھے سراب
سرابوں میں صحرا کو دیکھا نہ تھا
(خودرو)

اس رستے ظفر اقبال گیا تھا اک دن
وہ رہی اس کی گھڑاؤں کہاں جاؤ گے

بھوکے بچے سوچ رہے ہیں
جانے کس برتن میں کیا ہے
(شام سے پہلے)

شجاع سلطان کی اچانک اور بے وقت موت کی وجہ سے سرزمین کشمیر نہ صرف ایک سلیقہ مند مصور سے محروم ہوگئی بلکہ اُردو شاعری میں بھی ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا جسے صرف شجاع سلطان کی ذات ہی پُر کرسکتی ہے۔اور یہ امر ممکن نہیں۔مرحوم کا شعری مجموعہ فی الوقت ریاستی کلچری اکیڈیمی کی وساطت سے اشاعت کے مراحل سے گذر رہا ہے۔خوش قسمتی سے مذکورہ مجموعہ کا مسودہ میری نظر سے گزرا۔اس عمل سے میں شجاع کی شاعرانہ انفرادیت پر اپنی رائے ظاہر کرنے کا اہل بن گیا۔رنگوں سے فطری مناسبت ہونے کے باعث شجاع نے اپنی شاعری میں لفظ و معنی کے آہنگ کو مرکزی اہمیت دی۔انہوں نے فکر ونظر کے نئے جہانوں اور تخلیق کے نئے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر تخیل اور حسیت سے بھرپور کام لیا ہے۔انہوں نے جو پیکر تراشے ہیں ان میں حالات اور جذبات واحساسات کی تصویر نظر آتی ہے۔وہ رنج وغم، حیرت واستعجاب، اضطراب وسکون کی تصویریں لفظوں سے اس طور کھینچتے ہیں کہ نقل پر اصل گمان ہونے لگتا ہے۔ان کا تخیل ان کی قوتِ ایجاد کا سب سے بڑا منبع ہے۔

سیہ خلاؤں میں منزل کو ڈھونڈنے والو
تم اپنی خاک میں کیوں جستجو نہیں کرتے

اک حسرتِ نمود گلستاں رہی شجاع
سو وہ شکستہ صورتِ دیوار و در ہے آج

سکوتِ خواب میں سنگِ خیال تھا، کیا تھا

نظر کی لوح پہ حرفِ جمال کیا تھا

(خواب زار) زیر اشاعت

رخسانہ جبین اور سیدہ نسرین نقاش اس عرصے کی دو اہم شاعرات ہیں۔ رخسانہ کے مجموعۂ کلام کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر نے تعینِ قدر کے حوالے سے ان کی شاعرانہ شخصیت کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ ان کا جو کلام اِدھر اُدھر چھپتا ہے وہ ان کی شاعرانہ قدر کے تعین میں بہر حال ناکافی ہے۔ اتنا میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کے اشعار میں رومانیت کی ہلکی ہلکی خوشبو کے ساتھ ساتھ معاصر حالات کی گھٹن بھی ہے۔ ادھر کچھ دیر سے ان کی فکر کو عقیدتی، لہجے کے لوبان نے کچھ اور مشکبار کیا ہے۔

کھلی جو آنکھ تباہی کا خوف ختم ہوا
لرزتے ٹوٹتے گھر سب بھُلا دیئے میں نے

ثنا و حمد ادا کس طرح ہو لفظوں میں
مرے خدا نے مجھے ظرف سے زیادہ دیا

(شیرازہ، ہم عصر شعری انتخاب نمبر)

سیدہ نسرین نقاش کا کوئی مجموعۂ کلام مجھے بدست نہ ہو سکا۔ شیرازہ کے ہمعصر شعری انتخاب میں ان کی جو غزلیں شامل ہے اُن کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لہجہ نسوانیت سے عاری ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

الزام بے وفائی کا کس کس کے سر رکھوں
سچ تو یہ ہے میں آپ ہی اپنا رقیب تھا

سید رضاؔ نے اپنے کلام کو مرتب کرنے میں نہایت تساہل سے کام لیا ہے۔ وہ ایک توانا، لہجے کے شاعر ہیں۔ واقعۂ کربلا کے علامتی اظہار میں رضا کہیں کہیں افتخار عارف سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کشمیر کے شاعروں میں رضا کے یہاں واقعۂ کربلا کی جزئیات اور متعلقات سب سے زیادہ روشن نظر آتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ رضا نے اس واقعے کو اپنی غزلوں میں اگرچہ اہم موضوع کے طور پر برتا ہے مگر اسے مرکزی حیثیت نہیں دی۔ چنانچہ ان کے یہاں دیگر رجحانات کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ رضا ایک قادرالکلام سخنور ہیں۔

انکار، پیاس، آگ، لہو، تن دریدگی
کوفے سے ہو نصیب پلٹنا تو کیا لئے

نمو کا زور تھا خوشبو فضا
یہی تو ہے قفسِ رنگ میں بسر کرنا
(شیرازہ، ہمعصر شعری انتخاب نمبر)

اس دور سے تعلق رکھنے والے شعراء نے اپنی انفرادیت فکر و خیال کی گہرائی و گیرائی اور لب و لہجہ کی ندرت پر قائم کی۔،

۱۹۹۰ء کے بعد کشمیر کے جن شعراء نے اپنی شاعری کی شناخت کے لیے نئی طرز، نئے معیارات، نئی فکر اور نئے رجحانات کی تلاش میں اپنی فنی اور لسانی بصیرت سے کام لینا شروع کیا ان میں شفقؔ سوپوری، نذیر آزادؔ اور فرید پربتیؔ اہم ہیں۔ ان شعراء نے فنی اور سماجی شعور کو بروئے کار لا کر اپنے عہد کے اجتماعی احساسات اور جذبات کی نمائندگی کی۔ ان کی

غزلیں ایک ایسے جہانِ فکر کی جزئیات پر مشتمل ہے جہاں تخلیقی اقدار کے لیے سماجی اقتدار سے استفادہ کرنا اور اسلوبِ بیان کی سلاست، صلابت اور شفافیت کے لیے اس کا قابلِ فہم ہونا ضروری ہے۔ عالمی سطح پر جن شعراء کی طرزِ فکر اور پیرائیہ اظہار نے موجودہ غزل جسے مابعد جدید غزل بھی کہا جا سکتا ہے کے لیے نئے تخلیقی ضابطوں کو مرتب کرنے میں اپنی تخلیقی بصیرت سے کام لیا۔ شفقؔ سوپوری، نذیر آزاد اور فرید پربتی کے یہاں لہجے کی تہہ داری، مضمون آفرینی، لسانی دروبست اور جدت کاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں ملاحظہ ہو:

شفقؔ سوپوری:

مجھ سے رائج ہے یہاں مسلکِ اہل تسلیم
یعنی اب مرجعِ آشفتہ سراں بھی میں ہوں

کچھ سمجھتے ہیں صبا سے غزلِ برگِ گلاب
کچھ تو فرہنگِ بیاض گذراں کھولتے ہیں

یا تو چلتی ہے زمیں محورِ عبرت کے گرد
یارواں قافلۂ دل زدگاں رہتا ہے
(دشت میں دور کہیں)

نذیر آزاد:

جگائے خوشبو کے دل میں ہزار ہا فتنے
تپش سے مہر منور کی ڈر گئی ہے ہوا

صیّاد کے آئیں میں یہی درج ہے دیکھا
ہر صید زبوں ہر تنِ بسمل سے الجھنا

دشت وصحرا سے میں کیا کیا خار رکھتا ہوں
سانس پھوکی جا رہی ہے کاخ و کو کے درمیاں
(سبوچہ)

فرید پربتی:

زندگی کی حیرتوں میں پھر اضافہ ہوگیا
تھی جو ہونے کی توقع وہ کہاں ہونے کو ہے

زمانہ ہی نہیں واقف ہے مجھ سے
زمانے سے مگر میں آشنا ہوں

خوشبو کے تعاقب میں چل کر
صد برگ اور گلاب سے ڈر
(ہجومِ آئینہ)

۱۹۵۶ء کے بعد میں نئی غزل کا آغاز ہوا۔اس موضوع کے حوالے سے فرید پربتی لکھتے ہیں:

''شعراء مروجہ شعری رجحانات سے دامن کش ہوکر داخلی رویوں کی جانب متوجہ ہوئے۔آفاقی، ذاتی اور ملکی مسائل کو

اپنی ذات کے حوالے سے بیان کرنے کا رجحان بڑھنے لگا۔
اور قدروں کی شکست و ریخت اور حرمتوں کی بے حرمتی کے
واقعات موثر طریقے سے بیان کئے جانے لگے''۔ ۲۲

اس دور کے غزل گو شعراء میں حامدی کاشمیری، عابد مناوری، حکیم منظور، فاروق نازکی، یاسین بیگ، نشاط انصاری، پرتپال سنگھ بیتاب، اقبال فہیم، شجاع سلطان، رفیق راز اور ہمدم کاشمیری بطورِ خاص لیے جاسکتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

بھڑک گیا جو یہ شعلہ تو پھر بجھے گا نہیں
میں جانتا ہوں یہ ہرگز نہیں فنا انجام

یہ اور بات کہ بڑی ہے اور وحشتِ دل
چمن میں جاتا ہوں اب بھی صبا سے پہلے

وادیوں سے پھول رخصت ہو گئے
پھر وہی ایام بے تابی کے ہیں
حامدی کاشمیری

میں آندھیوں سے لڑوں گا یہ میں نے سوچا تھا
ہوا کا ایک ہی جونکا بجھا گیا مجھ کو
عابد مناوری

چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے

سلگ رہے ہیں مگر کہیں بھی دھواں نہیں ہے
حکیم منظورؔ

اس موسم کی پہلی بارش گھر ٹوٹا
اشک کہ آنکھوں سے ٹپکا اندر ٹوٹا
مظفر ایرجؔ

پڑھتے رہے ہمیشہ پُرانی کتاب ہم
اور ڈھونڈتے رہے ہیں نیا کوئی باب ہم
پرتپال سنگھ بیتابؔ

ریاست میں غزل گوئی کی جو روایت ابتداء سے چلی آرہی تھی اس میں مسلسل تغیرات رونما ہوتے رہے اور مختلف ادوار میں شعراء حضرات نے نئے نئے تجربات کئے۔اس کے علاوہ مختلف سیاسی، سماجی، ادبی تحریکوں اور رجحانات نے ان پر اپنے اثرات ثبت کئے۔ ریاست کے غزل گو شعراء نے نہ صرف روایت کی پاسداری کی بلکہ جدید تقاضوں کو بھی اپنے شعری تخلیقات میں پیش کرتے گئے۔انہوں نے نہ صرف عشق و عاشقی کے مضامین باندھے بلکہ دیگر شعبہ جات کے مسائل کو اشاروں اور کنایوں میں پیش کرتے رہے۔انہوں نے غزل کے دامن کو ہر طرح کے موضوعات سے مالا مال کیا۔

ریاست جموں و کشمیر جس سیاسی انتشار و خلفشار اور بے اعتنائی سے گذر رہا ہے اس کا اظہار بھی یہاں کے شعراء کی تخلیقات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر فنی بالیدگی کے ساتھ ملتا ہے۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شبینہ پروین لکھتی ہے:

''کشمیر آج کل جس دور سے گذر رہا ہے اس کا اثر یہاں کے

شعراء پر بہت گہرا ہوا ہے اسی لیے عام طور سے کشمیر کے نئے
شعراء کے کلام میں محرومی، بے چارگی، شکستگی، تنہائی کے
اثرات زادہ نمایاں ہیں۔ کبھی کبھی ان کے لہجے میں تلخی اور
بغاوت کی شعلگی کا احساس تو ملتا ہے لیکن وہ دبا سا ہی
ہے''۔ ۲۳

ماحول، اقدار و حالات کی تبدیلی ایک فطری امر ہے اور شاعری مختلف مراحل سے گذر کر ہر نئے دور میں نئی جہتوں کا سامنا کرتی ہے۔ اس طرح پرانے اور نئے میں فرق کرنا اگرچہ مشکل ہے تو اس کے باوجود کچھ تبدیلیاں راہ پا کر اپنا لوہا منواتی ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر کشمیر میں اردو غزل گو شعراء کی ایک نئی کھیپ تیار ہوئی جن میں کچھ کم، کچھ بہت زیادہ اپنے جدتِ مواد و اظہار کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح عصر حاضر کے شعراء کو ہم دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ گروہ جو پورے انہماک اور حتی الامکان جوش و خروش کے ساتھ لکھ رہے ہیں ان میں رفیق رازؔ، رخسانہ جبین، نذیر آزاد، سیدہ نسرین نقاش، شبنم عشائی، مرحوم فرید پربتی، شفق سوپوری وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے گروہ میں وہ شعراء ہیں جو بہت کم لکھتے ہیں جن میں خالد بشیر، اشرف ساحل، اشرف عادل، ساغر سلیم، فاروق آفاق، سید رضا، تنہا نظامی، مشتاق مہدی، اقبال صدیقی، اسرار احمد اسرار، نصرت آراء چودھری وغیرہ شامل ہیں، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

حواشی

۱: ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ادب، حامدی کاشمیری، ۲۰۱۰ء ص ۴۹

۲: شہہ زور کاشمیری شخص اور شاعر، فرید پربتی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱

۳: جموں وکشمیر کے قبائل اور ان کی زبان، ڈاکٹر جاوید راہی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰۔۲۱

۴: کشمیر میں اردو، جلد دوم، پروفیسر عبدالقادر سروری، ۱۹۸۴ء، ص ۴۸

۵: ایضاً، ص ۴۹

۶: شہہ زور کاشمیری شخص اور شاعر، پروفیسر فرید پربتی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳

۷: ایضاً

۸: ایضاً

۹: جموں وکشمیر کے قبائل اور ان کی زبان، ڈاکٹر جاوید راہی، ۲۰۱۲ء، ص۔۲۱

۱۰: جموں وکشمیر کے قبائل اور ان کی زبان، ڈاکٹر جاوید راہی، ۲۰۱۲ء ص ۲۱

۱۱: شہہ زور کاشمیری شخص اور شاعر، پروفیسر فرید پربتی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۴

۱۲: ایضاً

۱۳: کشمیر میں اردو، جلد دوم، پروفیسر عبدالقادر سروری، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۳

۱۴: کشمیر میں اردو، جلد سوم، پروفیسر عبدالقادر سروری، ۱۹۸۴ء، ص ۲۴

۱۵: ایضاً

۱۶: جموں وکشمیر کے قبائل اور ان کی زبان، ڈاکٹر جاوید راہی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۵

۱۷: شیرازہ اردو، شمارہ:۱۔۵، گولڈن جبلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱

۱۸: شہہ زور کاشمیری شخص اور شاعر، پروفیسر فرید پربتی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹

۱۹: ایضاً

۲۰: کشمیر میں اردو، جلد سوم، پروفیسر عبدالقادر سروری، ۱۹۸۴ء، ص ۱۰۸۔۱۰۹

۲۱: شہہ زور کاشمیری شخص اور شاعر، پروفیسر فرید پربتی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹

۲۲: شہہ زور کاشمیری شخص اور شاعر، پروفیسر فرید پربتی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹

۲۳: اردو غزل کی ثقافتی اساس، ڈاکٹر شبینہ پروین، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۲

باب چہارم

شفقؔ سوپوری کی شعری خدمات کا فنی جائزہ

۱۹۸۰ء کے بعد جموں وکشمیر میں اردو شعراء کی جو نسل سامنے آئی اُن میں ڈاکٹر شفقؔ سوپوری کا نام اس وجہ سے اہم ہے کہ انہوں نے اردو غزل کی شعریات اور رسومیات سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے عصری حسیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ فن کی سطح پر کئی اجتہادات کر کے اپنے شعری منصب کا پورا حق ادا کیا۔ اگر چہ بعض نقاد شفقؔ کی شاعری کو جدیدیت کے دور کی پیداوار مانتے ہیں اور بعض کا یہ کہنا ہے کہ شفقؔ سوپوری کی شاعرانہ مابعد جدیدیت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شفقؔ سوپوری کی شاعری کو فنی یا فکری سطح پر کسی خاص رجحان یا تحریک سے وابستہ کرنا ایک غیر منصفانہ عمل ہوگا۔ چنانچہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی یوں فرماتے ہیں:

> ''شفق سوپوری اُن معدودے چند نوخیز شاعروں میں ہیں جن کو اپنی شناخت کے لیے ترقی پسندی یا جدیدیت جیسی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں۔ اُن کی لفظیات بھی کسی مخصوص ادبی تحریک یا گروہ کی حد بندیوں سے مختلف ہے۔ اور اُن کا مافی الضمیر بھی بلاشرکت غیرے اپنا ہے''۔۱

اس بات پر لگ بھگ سارے تنقید نگار متفق ہیں کہ شفقؔ کی شاعری روایت اور جدت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ وہ غزل کی روایت سے بخوبی واقف ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اشعار میں نئی نئی ترکیبیں اور علامتیں استعمال کر رہے ہیں۔ شفق سوپوری حقیقت میں غزل کے رمز شناس ہیں چنانچہ وہ اپنی شاعری میں ہر اُس چیز کا خیال رکھتے ہیں جس سے شاعری پہچانی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر امین اشرف یوں فرماتے ہیں:

> ''شفق اپنی شعری روایت سے واقف ہیں اور اس روایت کا

عرفان انہیں تجربات کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ یہ تجربات اپنا
تخلیقی جواز غزل کی روایت سے حاصل کرتے ہیں۔ شفق نہ
روایت پرستی کی حد تک روایت سے منسلک ہیں اور نہ جدّت
پسندی کے جوش میں غزل کی مسلمہ روایت کو یکسر منہدم کرنے
پر آمادہ ہیں۔ وہ خارجی زندگی کے غیر موافق حالات اور ان
سے پیدا شدہ اپنے ردِعمل کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ پیش کرتے
ہیں۔ ایسا کلاسیکی رچاؤ جو ہم عصر زندگی سے بھی ہم آہنگ ہوتا
ہے''۔ ۲

یہ سچ ہے کہ شفقؔ سوپوری نے جس زمانے میں شاعری کا آغاز کیا، اُس زمانے میں جو ادبی تحریکات یا رجحانات کا سلسلہ ہمارے یہاں تھا اُن میں سب سے غالب اور قوی رجحان جدیدیت کا رجحان تھا، اور جدیدیت سے متاثر ہوئے بغیر جدید خیالات کو اظہار کے پیرائے میں لائے بغیر اور کچھ ممکن نہیں تھا۔ لیکن جدیدیت میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو روایت کے محترم اور صالح عناصر کو تجربہ بنا کر جدید پیرایۂ اظہار کو اپنا رہے تھے ان میں شفقؔ سوپوری کا نام بھی شامل ہے۔ شفقؔ نے جدید شاعر کی حیثیت سے بھی اپنا ایک الگ مقام بنایا جس کا اعتراف جدیدیت سے وابستہ ناقدین نے بھی کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شفقؔ نے روایت سے وابستہ رہ کر جدیدیت کے تقاضوں کو کس طرح پورا کیا ہے ؎

دشت میں دور کہیں دور سیہ ٹیلوں پر
ہیں مرے خواب کسی کے کفِ پا سے روشن

اُڑتے پھرتے ہیں لے کر مشتِ وجودِ خَس
جگنو کو بھی شرارہ سمجھا وحشت میں

سچے موتی کاغذی سیپوں میں بھر کر
راہزنوں سے مال بچانے والا تُو

مجھ سے رائج ہے یہاں مسلکِ اہلِ تسلیم
یعنی اب مرجعِ آشفتہ سراں بھی میں ہوں

ہماری خاک سے زیبائشِ عدم ہی نہیں
ہماری خاک سے رنگیں یہ گلستاں بھی ہے

اسی پر طائرِ غم آشیاں بنانے لگا
کہ ایک شاخ سی دل میں ہری لہو کی تھی

شفقؔ سوپوری کے یہاں عصری آگہی اور سماجی مسائل کے تخلیقی اظہار کا ایک منفرد طریقہ نظر آتا ہے۔ وہ عصری حسّیت کے تقاضوں کا بھرپور احساس رکھتے ہیں اور معاشرے میں پھیلے ہوئے تضادات اور اختلافات سے بھی نبرد آزما ہو رہے ہیں مگر اپنے فن کو کسی خارجی یا داخلی جبر سے بچا کر محض تخلیقی معیارات کی حد میں رہ کر اپنی شاعری اور اس کے قاری کے بیچ ترسیل کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ گذشتہ ڈھائی دہائیوں سے وادیٔ کشمیر انسانی خون کے

دریاؤں کا سنگم بنی ہوئی ہیں۔ کرب اور درد کے اس ماحول میں رہ کر، ہر واردات کا مشاہدہ خود کرنے کے باوجود بھی شفقؔ سوپوری کا احتجاج تخلیقی رویے سے سروکار رکھتا ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی یوں فرماتے ہیں:

> ''یہ اتفاق نہیں تو اور کیا ہے کہ شفقؔ سوپوری کی شاعرانہ سرگرمیوں کے عروج کا زمانہ عین وہی رہا ہے جو وادیٔ کشمیر میں بے اطمینانی اور خلفشار کا زمانہ ہے۔ اپنی معاصر صورت حال کا سامنا کرنے، اس سے متاثر ہونے اور اس کے ردّعمل کے طور پر مثبت یا منفی خیالات سے نبرد آزما ہونے کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جبر کے ساتھ اختیار اور صبر کے ساتھ احتجاج جیسے روّیوں کی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ چونکہ شفقؔ کا دردمند دل اپنے احساسات و جذبات کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا، اس لیے ان کی شاعری میں جذبہ ہو یا احساس انفرادیت کے بجائے اجتماعیت ہے اور ذات کی حدود سے نکل کر عام انسانوں کی تعمیم میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آتا ہے''۔ ۳

بات یہ ہے کہ شفقؔ سوپوری اپنے مشاہدات، جذبات اور احساسات کو تجربات کا جامہ پہنا کر تخلیقی رویے کا وقار رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کے تجربات سچائی کی ہر کسوٹی پر کھرے اترنے والے تجربات ہیں۔ وہ صورتحال کے مشاہد تو ہیں لیکن ان کا طریقۂ اظہار لفظ و پیکر کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آجاتا ہے مثلاً

میں اس کو زخموں میں ڈبو کر لکھتا ہوں
مجھ کو غم کے پرندے کا پر ہے صحرا

ٹھہر گئی ہے کہر سی فضائے مبہم میں
سحر کی دھند بھی ہے رات کا دھواں بھی ہے

میں جس میں اُڑتا تھا وہ فضا تھی آتش کی
میں جس پر بیٹھا تھا وہ دری لہو کی تھی

اتنا ہمارے تن کا لہو خشک بھی نہ تھا
ہم زخمِ دل کو غنچۂ تصویر دیکھتے

وہ کس طرح کی سیاست تھی میں سمجھ نہ سکا
عدو کی فوج میں کیسے غلام تھا میرا

جہاں کسی میں نہ ہمت تھی سر اٹھانے کی
اک ایسے ملک میں لشکر ہلاک تھا میرا

وہ بادِ بے تمیز چلی تو میں خود بخود

سمجھا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

مژدہ کوئی تو دے رہا ہے آندھیوں کا شور
کچھ کہہ رہی ہے قافلے سے میرے سر کی دھول

ایسے اشعار بقولِ سید امین اشرف وہ آہیں ہیں جو نارسا ہوتی ہیں، وہ جذبات ہیں جن کو زبان نہیں ملتی، اور وہ دکھ جو ایک گہرے کرب کے روپ میں حساس فنکار کے رگ و پے میں بے صوت گردش کرتا ہے۔ شفقؔ سوپوری کے یہاں معاصر حالات کے ردّعمل میں جو تخلیقی اور شعری روّیہ کارفرما ہے اس پر بحث کرتے ہوئے سیّد امین اشرف یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''چونکہ شفقؔ نے انسانی مستقبل کے قتل کا مشاہدہ براہِ راست کیا ہے، لہٰذا اُن کا کرب کچھ مواقع پر احتجاج اور واشگاف طنز کی صورت میں اختیار کر لیتا ہے۔ مگر احتجاج اور طنز کی یہ لے بیشتر معاصر شعراء کی طرح راست بیانی اور برہنہ گفتاری کی آئینہ دار ہو کر دستِ فن پر آنچ نہیں آنے دیتی''۔ ۴

چنانچہ احتجاج اور طنز کی اس لے کے پروقار بہاؤ سے شفقؔ کے یہاں تغزل کا نہ صرف روایتی انداز قائم رہتا ہے بلکہ اس میں جدّت کاری کے امکانات تمام تر تخلیقی قوت کے ساتھ ظاہر ہو جاتے ہیں مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ہم نے کس شوق سے پالا ہے ترے زخموں کو
جو موافق تھی اُسی آب و ہوا میں رکھا

کچھ تو قابلِ رفو تھی، مگر اب کے ہم نے
ایک بھی تار نہ موسم کی قبا میں رکھا

اس فکر نے ڈبو دیا طوفانِ زیست میں
ساحل سے دور ہم ہیں کہ کشتی سے دور ہیں

ہم نے اس خوف سے خیمے ہی جلا ڈالے ہیں
دھیان یونہی لگا رہتا سر و ساماں کی طرف

شفیق سوپوری کسی کسی جگہ پر طنز کے تخلیقی امکانات کو بھی بروئے کار لا کر صورتِ حال کی المناکی کو پوری جذباتی قوت اور شدت مگر فنی ترفع کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں کہ قاری حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے مثلاً ؎

تیری آواز مقدس ہے مگر میرے ضمیر
بھوک کے آگے اس آواز کی کیا چلتی ہے

کچھ نہیں ہم سوائے مصنوعات
کارخانہ یہ سب اجل کا ہے

یہ بار بار گریباں کو دیکھتے ہو کیا
مرا لہو تو تری آستیں سے روشن ہے

ہونا گماں روزنِ زنداں پہ چاند کا
کرنا سکوت آتشِ آہ اسیر کا

جلنا ہر آشیاں کا بجلی سے ناگہاں
بچنا چمن میں طائروں کے بال بال پر

احتجاج اور طنز کے علاوہ بقولِ سید امین اشرف ان کا یہ ردّعمل کچھ مقامات پر گہری یاسیت کا حامل ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو اس کاروبار بود و فنا میں انسان کی بے چارگی اور اس کے جدوجہد عمل کی رائیگانی کا احساس کچھ زیادہ ہی شدت سے ہے ؎

سفر میں سوختہ و خستہ جاں کسی کے لیے
تمام عمر پھرے رائیگاں کسی کے لیے

ہیں وہ بانِ موجِ ہوا خانماں خراب
بھٹکے مسافروں کا کوئی کارواں نہیں

فیصل خواب کے گمنام گوشے سے کل شب
میں گر گیا تو ترے راستے کا پتھر

یا یہ لاجواب شعر جو اپنے اندر نہ جانے کتنے معنوی امکانات رکھتا ہے ؎

جس شئے کو ڈوبتوں نے جزیرہ سمجھ لیا

گرد و غبار خواب ہے سیلابِ خون میں

شفقؔ کی شاعری میں کسی خاص نظریئے، میلان یا فلسفے کی تلاش ممکن نہیں، انہوں نے اپنے ذاتی تجربات، اپنے معاشرے کی شکست وریخت، اپنے زمانے کے درد و کرب اور دیگر کیفیات کو یوں شعری پیرائے میں ڈھالا ہے کہ جدت کے ساتھ ساتھ معنی کی تہہ داری بھی پیدا ہوگئی ہے اور یوں ان کا کلام عصری حسیت سے معمور ہو جاتا ہے، مگر وہ جگہ جگہ پر ہوشمندی اور دانشمندی کے ساتھ تخلیقی تقاضوں سے سروکار رکھتے ہیں۔ اسی خصوصیت کو ان کی شاعری کا ایک امتیاز تصور کر کے سید امین اشرف یوں فرماتے ہیں ؎

''یہ دیکھتے ہوئے کہ بیشتر نوجوان شعراء مسائل حاضرہ کو بغیر کسی فنی التزام کے تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں، یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ایک نوجوان شاعر نہ صرف اپنے عہد کے مسائل اور میلانات کا عرفان رکھتا ہے بلکہ اپنے ردِعمل کو غزل کے تمام تر فنی نزاکتوں کے ساتھ حیطۂ اظہار میں لانے کی صلاحیتوں سے بھی بہرور ہے اور اس سے زیادہ خوش آئند یہ امر ہے کہ شفقؔ محض حالات کے شعری انعکاس اور اپنے ردّعمل کے اظہار تک خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ سطح پر موجود صورتِ حال اور اس سے وابستہ تصورات کے باطن کا بھی مشاہدے میں لاتے ہیں۔ نتیجتاً ان مفکرانہ مشاہدات کی فنی قلب ماہیت کے ذریعہ جو غزل وجود میں آئی ہے وہ ان حقائق

کے شعری اظہار کا رشتہ ازلی بصیرتوں سے استوار کرتی ہے۔
اشعار دیکھئے ؎

تشنگی جب کسی معصوم کو تڑپانے لگی
تیر اندازوں کے رُخ اور بھی سفاک ہوئے

گزر گیا یہاں سے کوئی فراق پسند
ہوئی ہے پیڑ سے جو شاخ تھی ہری غائب

میں نے کردی ہے سیہ آب و ہوائے دنیا
اُس نے آیت کی طرح مجھ کو اتارا تھا

اٹھایا ساتواں در تو کیا دیکھا
گماں کی ظلمتوں میں تھا یقین روشن
عجب نہیں کہ لگے ہاتھ اسم اعظم اب
پھر ایک بار پرانی کتاب دیکھیں گے،،۔۵

ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے سید امین اشرف فرماتے ہیں کہ ان میں سب سے پہلے جو چیز ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ ہے ان میں موجود تخلیقی پراسراریت ہے۔ وہ تخلیقی پراسراریت جو شاعرانہ بیان کو عام بیان سے ممیز و ممتاز کرتی ہے اور فکر و خیال کو شعر کے درجہ پر پہنچاتی ہے۔

یہاں شاعر نے معاصر سچائیوں کو مشرق کی مہتمم بالشان روایت کی روشنی میں ازلی حقائق سے مربوط کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی مٹتی ہوئی تہذیبی اور اخلاقی روایت کی بازیافت کی سعی بلیغ بھی۔ یہ وہ اشعار ہیں جن میں تخلیقی وجدان کا رشتہ روحانی عرفان سے مربوط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

معاصر حسّیت کی ترجمانی کے حوالے سے شفقؔ سوپوری کی شاعری کے بارے میں یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حالات و واقعات کے تخلیقی اظہار کے ساتھ اپنی ارض وطن یعنی کشمیر سے بے پناہ محبت وانس کا اظہار جگہ جگہ پر کیا ہے اور بقولِ پروفیسر ابوالکلام قاسمی ''شفق سوپوری زندگی کے ہر رنگ سے واقف ہیں چنانچہ ان کی شاعری میں مقامی رنگ و آہنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کشمیر کی ہر واردات، ہر مسئلے اور اپنے ماحول کی سچی عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے،،۔٦ اور پروفیسر شہپر رسول کے الفاظ میں ''شفقؔ نے خاص طور سے کشمیر کے حُسن اور اس کے کلچر اور جغرافیائی تخصیص کے حوالے سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کشمیریت کی ترجمانی کی ہے،،۔٧ یہ سچ ہے کہ شاعر کسی بھی طرح سے مقامی اثرات سے اپنا دامن بچا نہیں سکتا اور یہ ایک طرف کا شعری فریضہ بھی ہے کہ شاعر اپنے ماحول کے انتشار اور تذبذب پر گہری نظر رکھ کر حالات کے بیان کا بہر طور اہتمام کرے مگر اس میں کئی فنی لوازمات کو مدنظر ضروری رکھنا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر شاعر اپنے مقامی حالات سے صرفِ نظر کرے تو یہ ایک طرح سے اس کی تخلیقی ناکامی سے تعبیر کیا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اگر شاعر کے یہاں مقامی رنگ غالب ہوا تو اس کے یہاں نہ صرف معنوی امکانات سمٹ جائیں گے بلکہ اس کی فکر خواص کے دائرے میں رہ کر عوامی خواہشات کی ترجمانی کرنے میں ناکام ہو جائے گی۔ تیسرا یہ کہ جو شاعر مقامی اثرات میں آفاقیت نہ لا سکے وہ تخلیقی سطح پر خود اپنی موت

کا اعلان کر دیتا ہے۔ شفقؔ کے یہاں ایسا نہیں، وہ اپنے مقامی حالات سے نبرد آزما ہوتے ہیں مگر ان کا برتاؤ بہر حال تخلیقی ہوتا ہے۔ اسی لیے پروفیسر قدوس جاوید یوں فرماتے ہیں:

> ''شفق سوپوری کی غزلوں میں کشمیر کی منفرد تہذیب و ثقافت کے عناصر تو ہیں ہی، مگر ان کی شناخت محض کشمیر کے شاعر کے حیثیت سے نہیں بلکہ اُردو دنیا کے چند معتبر شعراء کے ساتھ ہوتا ہے۔ کشمیر میں رفیق رازؔ، ایاز رسول نازکی، رخسانہ جبین، نذیر آزادؔ وغیرہ اُن کے معاصر شعراء ہیں، لیکن کشمیر سے باہر اُردو کے نمائندہ معاصر غزل گو شعراء مثلاً عرفان صدیقی، مہتاب حیدر نقوی اور عبدالاحد ساز وغیرہ کے ساتھ اگر کشمیر کے کسی اُردو شاعر کا نام پورے وثوق سے لیا جا سکتا ہے تو وہ شفقؔ سوپوری ہی ہیں۔ شفق سوپوری کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں وقت اور زمانہ کے ساتھ بدلتے ہوئے تخلیقی رویوں کا پورا احترام ملتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی شفقؔ سوپوری غزل کی کلاسیکی روایات کے تقدس کو کہیں بھی پامال نہیں کرتے''۔ ۸

چنانچہ شفقؔ سوپوری کا لسانی برتاؤ اور جمالیاتی احساس آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر ترسیل کے نئے اور انوکھے راستے ہموار کرتا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جب عزیزوں کی یاد آتی ہے
کیا گزرتی ہے سوگواروں پر

سب مشقت مرے نالۂ درد کی
میرا طرزِ بیاں رائیگاں رائیگاں

سنگ ہائے نہاد ہیں شاید
اس جگہ پر فصیل تھی پہلے

غور سے اس منڈیر کو دیکھو
یہ حسین و جمیل تھی پہلے

یہ دریچے کسی نے کھولے ہیں
کہہ رہے ہیں نشان کیلوں کے
کون سے وہ درخت تھے جن پر
کوئلیں کوکتی تھیں ساون میں

ہلاکت کو بجا ٹھہرانے کی خاطر
جھڑپ کرتا ہے میرا میلہ گر فرضی

یہ کس دیار سے بادل گرجتے آرہے ہیں

یہ کن ہواؤں سے پتّے جھگڑ رہے ہیں میاں

سار بانوں کی صدا سن کر
قافلے والے سو گئے میرے

ہم نے آگ لگادی سارے خیموں میں
ہم نے جرس کو ساز بنا کر رقص کیا

ہم نے جنوں میں ساری رسمیں توڑی ہیں
ہم نے گلوں کے مرجھانے پر رقص کیا

متذکرہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شفقؔ سوپوری اپنے شعری پس منظر کو عصری آگہی سے کشید کر کے شعری مطالبات سے تخلیقی سطح پر برتاؤ کرتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ خوبی پر جاوید انور یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''شفقؔ سوپوری کے شعری پس منظر میں عصری آگہی کا بہت دخل ہے۔ اُن کے شعری مطالبات ان کی تخلیقی قوت کو اس طور متاثر کرتے ہیں کہ تہذیبی روایات اور اساطیر کے آئینے میں موجود عہد اور ذات و کائنات کے توازن کا سراغ لگانے کی جستجو ان کے تخلیقی عمل کا ایک ناگزیر حصہ محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے تہذیب اور تاریخ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے

اپنے سماج کی تہذیبی اور روحانی توسیع کا ذریعہ تصور کیا ہے۔
شاعری کے توسط سے نئے جمالیاتی افقوں کی جستجو کا عمل زندگی
کے موجود اور لاموجود کے معنوی انسلاک کی جانب اشارہ کرتا
ہے۔ان کے تخلیقی اظہار میں اپنے سماج اور معاشرے کے
ایک نامعلوم کرب بھی موجود ہے، جس کی جڑیں صدیوں کی
تاریخی تہوں میں اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔اس طرح ان کے
اشعار معنویت کے اعتبار سے مختلف ہیں اور شدید اثر رکھتے
ہیں''۔۹

شفقؔ سوپوری کی غزلوں میں طلسماتی فضا نظر آتی ہے اس کی تشکیل شفقؔ کے گہرے تاریخی، تہذیبی اور تمدنی شعور سے ہوتی ہے۔ یہ طلسماتی فضا عام طور پر قاری کو استعجاب کی کیفیت سے گزار دیتی ہے۔ چونکہ شفقؔ ایسی صورت میں بلا واسطہ طور پر تلمیحات سے گریز کرتے ہیں لہٰذا نہ صرف قاری متحیر ہو جاتا ہے بلکہ اس کے خواص انگیخت ہو کر شعر کے مفہوم تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ اشعار ؎

دشت در دشت ترے نور کے پرکالے تھے
سمت در سمت ہوا مجھ کو اشارہ روشن

آگ سے بھی مجھے محفوظ وہی رکھے گا
حسن وخاشاک میں کردے جو شرارہ روشن

اُترے ناقۂ دل لیکر اور ڈوب گئے
دریا کو بھی صحرا سمجھا وحشت میں

سونے کے مٹکوں میں کھوٹے سکوں کا
سارا خزانہ یونہی لٹانے والا تو

اوران کے ساتھ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو بالکل داستانوی کیفیت پیدا کرتے ہیں ؎

پھول اک باغ فسوں گر سے چرانا میرا
پہلے اُس پیکرِ خوشبو کو جگانا میرا

دیوار جہاں کل تھی وہاں گوشۂ گم میں
عبرت کے لیے سایۂ دیوار کا ہونا

دیکھنا تربتِ درویش پہ موہوم سی لو
سوچنا اس کے تئیں غولِ بیابانی کا

دنیا بیا بیا صدا دشتِ قیاس میں
ہونا غبارِ راہ میں گم ہمرکاب کا

لگنا نہال سبز کا ہر برگ زہر باد

ہونا گماں سانپوں کا پیڑوں کی چھال پر

ایسے بہت سے اشعار شفقؔ کے کلام میں موجود ہیں جن کا خمیر داستانوی رنگ ڈھنگ سے بنتا ہے اور ایک ایسی طلسماتی فضا قائم ہو جاتی ہے جہاں علامتوں اور اشعاروں کی روشنی میں معنی کی کئی جہتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اگر چہ اُردو شاعری میں اس نوع کے تجربات پہلے بھی کئے گئے ہیں اور مثال کے طور پر اسعد بدایونی کی ان غزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو داستانوی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں مگر شعری برتاؤ اور تخلیقی امکانات کے حوالے سے شفقؔ کا تجربہ اس اعتبار سے منفرد ہے کیونکہ انہوں نے بادشاہوں کے محل، حرب وضرب کے میدانوں، حرم سرا کی عیاشیوں وغیرہ سے اپنے تخیل کو آزاد کر کے ایک ایسی داستانوی اور طلسماتی دنیا آباد کی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔

شفقؔ کے کلام میں اس اعتبار سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایسی کیفیات پیدا کرنے کے لیے تخیل اور وجدان کے علاوہ اپنی روحانی بصیرت اور درویشانہ فکر اور دانش سے بھی کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو اعتراف کرنا پڑا کہ ''شفق کی شاعری میں ایک درویشانہ تمکین اور بے نیازی کا انداز جگہ جگہ جھلکتا ہے،،۔ ۱۰

اس سلسلے میں کرشن کمار طور مزید وضاحت کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

> ''شفق سوپوری ایک غیر مرئی دانش سے منور شاعر ہے ان کا شعری تخلیقی اظہار ان کی لسانی قوت سے مظہر ہے، جس کی چھوٹ دور دور تک ان کے باطنی سفر میں پانی میں چراغ جلانے کی مترادف ہے''۔ ۱۱

نتیجہ یہ کہ شفقؔ سوپوری عقیدے سے وابستگی اور روحانی تقدس کا مظاہرہ کرتے ہوئے

اپنے شعری تجربات میں تخلیقی پراسراریت پیدا کرتے ہیں۔ سید امین اشرف کا یہ فرمانا درست ہے کہ ''شفق کے شعری وجدان کا رشتہ صحرا اور اس کے متعلقات سے کافی گہرا ہے اور یہ کہ صحرائی فضا ان کے لاشعور پر ہمیشہ چھائی رہتی ہے''۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ صحرائی فضا شفقؔ سوپوری کی وجدانی قوت سے متشکل ہوجاتی ہے اور ان کی دانش سے جو اسطور نمو پذیر ہوجاتی ہے اس میں تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی شعور موتیوں کی طرح چمک رہا ہے مثال کے طور پر یہ اشعار ؎

میں نے اکھاڑیں کل ٹیلوں کی سب قبریں
دیکھو آج کی رات برابر ہے صحرا

سر سے گذرتی موج اگر پیاس کی کبھی
ہم دشت میں سراب کو دریا ہی مانتے

تم اس قدر بھی خراب نہ جانو دل کو مرے
کسی فقیر کا اس دشت میں مکاں بھی ہے

گئے کاروانوں سے بچھڑے ہوئے
قبائل بھی ہوں گے اسی راہ میں

کہنا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

صحرا سب کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

سمجھا کہ اڑ رہا ہے دلِ قیس کا غبار
دیکھا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

اضافہ وحشتِ دشتِ بلا میں کرنے کو
ہمارے ریت کے گھر میں ہوا نے رقص کیا

لسانی سطح پر جو اجتہادات شفقؔ سوپوری نے کئے ہیں وہ ان کے گہرے لسانی شعور اور غزل کی رسومیات اور روایات دونوں سے ربط کے نتیجے سے پیدا ہوتا ہے۔ شفقؔ سوپوری فن شاعری کے علاوہ موسیقی اور علمِ عروض پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہر فن میں اپنی راہ آپ نکالی ہے۔ وہ غزل کے معتبر اور مستند شاعر ہیں اور ان کے یہاں لفظیات کا بے حد حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں:

''میں انہیں (شفقؔ سوپوری کو) مبارکباد دیتا ہوں کہ
انہوں نے آسان اور مقبول راہوں کو چھوڑ کر اپنی راہ نکالنے کی
کوشش کی ہے جو اگرچہ مشکل ہے لیکن اس کے مسافر کو قدم
قدم پر کامیابی کا مژدہ بھی سناتی ہے''۔ ۱۲

شفقؔ سوپوری کی اس شاعرانہ خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ایک نمایاں معاصر رفیق رازیوں کہتے ہیں کہ ''انفرادیت پسندی اور تکمیلیت پسندی اُن کی (شفقؔ کی) ادبی شخصیت کے دو نمایاں پہلو ہیں اور یہی دو پہلو انہیں مشکل پسند بناتے ہیں۔ شفقؔ سوپوری نے ادب کے

ہر میدان میں آسان اور ہموار راہیں ترک کر کے دشوار گذار راستوں پر چلنا پسند کیا۔ وہ اگر چہ خالصتاً غزل کے شاعر ہیں مگر انہوں نے یہاں بھی پیش پا اُفتادہ راہوں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی روش ایجاد کی۔ اس ایجاد میں ان کی مشکل پسندی کو ہی دخل ہے۔ شفقؔ نے جو طرز ایجاد کی ہے اسے بجا طور پر طرزِ شفقؔ کہہ سکتے ہیں،،۔ ۱۳ اسی نکتے کی وضاحت پروفیسر شمیم حنفی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''شفقؔ اپنے عصر کے مزاج کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ شعری اظہار اور عمل کے تقاضوں کو خوب سمجھتے ہیں اور اپنی ایک الگ پہچان قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں زبان و بیان کی باریکیوں کا جیسا شعور حاصل ہے اس دور میں کم کم دکھائی دیتا ہے، لیکن ان کی شاعری فکری اعتبار سے بھی ثروت مند ہے اور ہر دور کے سنجیدہ قاری سے ایک ربط استوار کر سکتی ہے''۔ ۱۴

شفقؔ سوپوری کے لسانی برتاؤ کے بارے میں پروفیسر قدوس جاوید کا یہ فرمانا ہے کہ ''شفق سوپوری چونکہ زبان دان ہیں، اہلِ زبان سے کہیں زیادہ بہتر اور پختہ لسانی شعور رکھتے ہیں۔ اس لیے شفقؔ سوپوری کے یہاں الفاظ کا شعری برتاؤ ان کے پورے تہذیبی، لسانی اور اقداری نظام کا پرتو ہوتا ہے''۔ شفقؔ سوپوری کا گہرا لسانی شعور ان کی شاعری میں لفظ و پیکر کی فراوانی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر پروفیسر حامدی کاشمیری کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کشمیر کی نئی نسلوں میں شفقؔ سوپوری نہ صرف نسبتاً گہرے تخلیقی شعور کا احساس دلاتے ہیں بلکہ لفظ و پیکر کی فراوانی اور تازہ کاری کا احساس بھی دلاتے

ہیں''۔۱۵

شفقؔ سوپوری کا شعری تخلیقی اظہار بجا طور پر ان کی لسانی قوت سے ظاہر ہوتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ اس ضمن میں یوں فرماتے ہیں:

''شفقؔ کو خدا نے تخلیق کی غیر معمولی سعادت بخشی ہے۔ بالخصوص اس طور کی غزلوں سے ہمیں کم ہی سابقہ پڑتا ہے۔ یہ حسّیت، یہ بصیرت، لفظوں کا یہ جماؤ، یہ سلیقہ نئے شعراء میں بہت کم نظر آتا ہے''۔۱۶

شفق سوپوری کے لسانی برتاؤ پر مزید کچھ کہنے سے پہلے کرشن کمار طور کا یہ اقتباس نقل کرنا برمحل ہوگا۔ طور صاحب فرماتے ہیں:

''شفق سوپوری کا شعری تخلیقی اظہار ان کی لسانی قوت سے مظہر ہے، جس کی چھوٹ دور دور تک ان کے باطنی سفر میں پانی میں چراغ جلانے کے مترادف ہے۔ وہ فنا فی الشعر ہی نہیں، فنا فی الذات بھی ہیں۔ گویا ان کی شاعری محض انکشافِ ذات کا پرتو ہی نہیں بلکہ حیات کے افہام و تفہیم کی اثباتی منزل کا سراغ بھی دیتی ہے اور جذب کے وسیلے سے عرفان کے لالہ زار میں خوشبو بیز کے مماثل ہے۔ ان کی باطنی شاعری نفی کے ظاہری نظام میں ابھی تک گل ریز ہے۔ شفق سوپوری اپنے لفظ، خیال، اسلوب اور معنی سے شعر کو ایک ایسی وارداتِ قلبی بنا دیتے ہیں جہاں ان کی تخلیقیت آفرینی امتیازی خصوصیت

سے متصف ہے۔ وہ استعارہ نہیں بلکہ شعور سے اپنی شعری
عناصر کو ترتیب دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پڑھنے والا
ان کی ذہنی سطح سے کبھی ازکار نہیں ہونے پاتا۔ ان کے اور ان
کے قاری کے درمیان ایک غیر مرئی تعلق ہمیشہ استوار رہتا ہے
اور ان کے تخلیقی اشتراک کی دانش سے منور ابلاغ، ترسیل اور
محاکات، ان کا لازمۂ شعر ہیں اور ان کی غنائیت کا اعتبار اور
وجود بھی''۔ ۱۷

شفق سوپوری اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اگرچہ شاعری لفظوں کی ایسی خوش آہنگ ترتیب و تنظیم کا نام ہے جس کی تہہ میں تجربات زندگی سے وابستہ انسانی جذبات و احساس کے لطیف ارتعاشات موجزن ہوتے ہیں، لیکن لفظوں کی یہ ترتیب و تنظیم کوئی آسان عمل نہیں۔ شفق سوپوری کو لسانی ترتیب کاری میں ایک عرصے تک خونِ جگر صرف کرنا پڑا ہے۔ اور اب وہ اس منزل پر آ گئے ہیں کہ انہیں مخصوص اور مطلوب منزل مل گئی ہے جس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

سیکھ لے جست لگانے کا ہنر بھی پہلے
کیا خبر زندگی غائب کوئی زینہ کر دے

نئی بہار میں ہنگامۂ قفس کے بیچ
کہاں دماغ ہمیں حالتِ صبا پوچھیں

یہ خاک پھانک رہی ہیں جو، ان صداؤں کا
مرے سکوت کے عالم سے کوئی رشتہ ہے

بس ایک آنکھ ہے شعلے کی دیکھتی ہے جو
کہ میں الاؤ کو، مجھ کو الاؤ دیکھتا ہے

اے مرے دل کی وارداتِ ملال
میں تری سنسنی سے ڈرتا ہوں

کس خواب سے تو چونک اٹھا اے گُلِ خیال
گھبرا کے ایسے آنکھ نہ مل، آ کے مجھ سے مل

بادِ نمناک کو دینی تھی صدا جنگل میں
اور پتوں کو ترے غم میں گرا دینا تھا

کلامِ شفقؔ کے لسانی دروبست کی ایک نمایاں خوبی ان کی ترکیب سازی ہے۔ شفقؔ کی ترکیب سازی میں اگرچہ کہیں کہیں اضافت در اضافت موجود ہے مگر یہ معنوی سطح پر ہر حال میں اپنے قاری سے رشتہ بناتی ہے۔ یہ خصوصیت شفقؔ کے فنی انہماک اور ارتکاز پر دلالت کرتی

ہے۔کئی مقامات پر شفق سوپوری نے نادر تراکیب تراش کر اپنی لسانی بصیرت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے مثلاً ''خس وخاشاکِ بدن''، ''مالِ نفس''، ''ناقۂ دل''، ''تصویرِ گردِ صحرا''، ''در پردۂ چشمِ نگراں''، ''سرخیلِ اسیرانِ فصیلِ ہجراں''، ''مسلکِ اہلِ تسلیم''، ''مرجعِ آشفتہ سراں''، ''والیٔ سلطنتِ دل زدگاں''، ''نخلِ سیہ بخت'' وغیرہ۔

میں ہی سرخیلِ اسیرانِ فصیلِ ہجراں
والیٔ سلطنتِ دل زدگاں بھی میں ہوں

مجھ سے رائج ہے یہاں مسلکِ اہلِ تسلیم
یعنی اب مرجعِ آشفتہ سراں بھی میں ہوں

حسن وخاشاکِ بدن شامِ قضا سے روشن
شمعِ انفاس ہو کیوں موجِ ہوا سے روشن

اترے ناقۂ دل لے کر اور ڈوب گئے
دریا کو بھی صحرا سمجھا وحشت میں

جو تم نظر نہ آتے تو ہم اپنی آنکھ کو
تصویرِ گردِ گوشۂ صحرا ہی مانتے

شفقؔ سوپوری کی غزلوں کی لسانی ساخت اور معنیاتی نظام اس قدر وسیع ہے کہ ان کے اشعار کی مختلف جہات کا جائزہ لئے بغیر مکمل تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ جب تک شفقؔ کے کلام کی لسانی ساخت اور معنیاتی نظام کا تہہ در تہہ مطالعہ نہ کیا جائے اس کے ساتھ انصاف کرنا مشکل ہے۔ اس سلسلے میں ان کی پیکر طرازی اور علامت سازی کا تجزیہ کر کے ان کی شعری جمالیات کے کئی گوشوں کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔

شفقؔ سوپوری اپنے تجربات کے تخلیقی اظہار کے لیے غزل کو ذریعہ بنا کر ایک ایسے لسانی رویئے سے سروکار رکھا ہے جو موضوع اسلوب اور قاری کی مثلث تشکیل دیتا ہے۔ شفقؔ پیکر تراشتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ پیکر قاری کی روح میں خفتہ جذبات و احساسات کو جگا کر ابلاغ کی موثر سبیل کا ذریعہ بن جائے۔ شفقؔ پیکر تراشتے وقت اُسے تزائید لفظی کا شکار نہیں ہونے دیتے بلکہ کہیں کہیں محض ایک لفظ، تشبیہہ اور استعارے سے ایک ایسی صورت تراشتے ہیں جس سے قاری کو متن کے اندر چھپے ہوئے معنوی امکانات تک رسائی ہو جاتی ہے۔ شفقؔ کے تراشے ہوئے پیکر گنجلک نہیں کہ قاری بھٹک کر رہ جائے بلکہ قاری کو لفظوں کے اندر پنہاں دور افتادہ آہنگ کا احساس بھی دلاتے ہیں ؎

بچھڑ رہا ہے جو شعلے سے اُس دھوئیں کا شفقؔ
ضرور سوختنی کے نم سے کوئی رشتہ ہے

بس ایک آنکھ ہے شعلے کی دیکھتی ہے جو
کہ میں الاؤ کو اور مجھ کو الاؤ دیکھتا ہے

زرد بیلوں پہ ہانپنے والی
بھُر بھُری چاندنی سے ڈرتا ہوں

دف بجاتی ہوئی سانسوں پہ تھرکتا ہوا تن
کہہ رہا ہے کہ چراغوں کو بجھا دینا تھا

جیسے تم خواب کے اُفق پر ہو
اور ہم بادلوں پہ چلتے ہیں

میری بھیگی قمیص پر کیسے
لگ گیا رنگ تیرے کُرتے کا

ایک تصویر کے کنارے پر
کسی یُگ کے لہو کا چھینٹا تھا

متذکرہ بالا اشعار پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ شفقؔ سوپوری کے یہاں پیکر طرازی کے عمل میں نہ صرف اجمال اور اختصار کی کارفرمائی ہے بلکہ ان پیکروں کی تازہ کاری فروغ پا کر پُر جوش تجربات کے وسیلے سے ابلاغ کے راستے کھول کر حقائق کا انکشاف کر کے

انہیں قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔شفقؔ کے پیکروں سے ایک اعلیٰ اور ارفع قسم کی جمالیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کے اندر پنہاں لفظی آہنگ اور استعاروں یا تشبیہات کے حسی انسلاکات قاری کو ان پیکروں کی نسبت شناخت کرنے کے گہرے انبساط اور کیف سے دوچار کرتے ہیں۔شفقؔ سوپوری بصری، سمعی، شامعی، لمسی، حرکی غرض ہر قسم کا پیکر تراشنے میں خلاقانہ مہارت اور فنکارانہ ہنر رکھتے ہیں۔وہ پیکروں کو بنیاد بنا کر لفظوں، استعاروں اور ان کے تلازمات سے شاعرانہ سچائی اور مظاہر کے درمیان ایک غیر مرئی وحدت قائم کرتے ہیں۔ شفقؔ سوپوری کی غزلوں میں استعارہ سازی کی خلاقانہ صلاحیت ان کے اسلوب سے ایک ایسا رشتہ قائم کرتی ہے جہاں پیکر الفاظ کی تازہ کاری اور مضمون سے زرخیز ہو کر قاری کو مشاہدے اور تجربے کا مشاہد بنا دیتا ہے۔مثال کے طور پر یہ اشعار ؎

کچھ اُس چاند پری کا بھی احوال سُنا
لہروں میں وہ دھند سفینہ کہاں گیا

اُس قبیلے کا وہ کوئی بادل تھا
شاخ پہ اِک رومال جوگیلا چھوڑ گیا

جانے کس شعلے کی کتھا سنتے سنتے
میں وہ سورج ہوں جو نکلنا بھول گیا

اوس نے جن پر پہلے پلکیں کھولی تھیں

میں ان سارے پتوں کو جلا چکا ہوں

میں نے دروازہ جیسے ہی کھولا
سامنے مکڑیوں کا جالا تھا

واقعہ یہ ہے کہ بقول جاوید انور ''شفق سوپوری نے انسانی تجربات کو خیر وشر کے انسانی عمل کی مختلف ہستیوں کے پس منظر میں برتا ہے۔ یہاں بنیادی مسئلہ اظہار کی نوعیت اور اس کی معنویت کی تبدیلی نہیں ہوتی اس لیے کہ سماجی اور تمدنی رشتوں کی وضاحت وصراحت کے لیے وہ شعری پیکر کام دیتے ہیں جو تجربات کی فنی قدر و قیمت سے مربوط ہیں۔ شفق سوپوری کے یہاں مخصوص ماحول کے سیاسی اور سماجی موضوعات کو اپنی داخلی شخصیت سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہیں ملتی۔ یہاں ان کی مخصوص افتادِ طبع کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔ خارجی زندگی کے ادراک کے سلسلے میں ان کے افکار وتصورات جو جمالیاتی پیکر اختیار کرتے ہیں۔ وہ ان کی ذی الحسی کا عطیہ ہیں جو زندگی کے تیز وتُند جذبات، کرب واضطراب اور نشیب وفراز کی مختلف منزلوں کا مشاہدہ کراتی ہیں''۔ ۱۸

اسی طرح شفق سوپوری کی علامتیں ان کی فکری کائنات کی وسعت اور فنی دروبست پر دلالت کرتی ہیں۔ شفق کے یہاں بیاباں، ریت قافلہ، وحشت، دشت وجبل، خس وخاشاک، سراب، غزالاں، دھوپ، سرا، جنگل، تشنگاں، خیمے، اونٹ، قبائل کے پہلو بہ پہلو تتلی، روشنی، بھنور، اوس، کاسنی پل، موجۂ مجذوب، نمک، سانوے دیس، بھیگی قمیص، بانی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو استعارے کی سطح سے اٹھ کر علامتوں کا روپ اختیار کرتے ہیں اور علامتی سطح پر اپنے انسلاکات سے ایک ایسی صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہیں جس میں سفر کی رنجشوں اور صعوبتوں کی

روداد بھی ہے اور ذات و کائنات کے تفاعل کے نتیجے میں حاصل شدہ تجربات کا بیان بھی ہے

گھر کیا سایۂ دیوار در ہے صحرا
مجنوں کا تو ہر حال میں گھر ہے صحرا

سانپ بانبی میں گھُس گئے لیکن
مجھ کو چمگادڑوں نے گھیرا تھا

میری بھیگی قمیص پر کیسے
لگ گیا رنگ تیرے کُرتے کا

کہ جیسے موسمِ گل کے قبیلے سے ہیں ہم
کہ جیسے تیلوں کا ہم سے کوئی رشتہ ہے

مجھ سے ہوا کا موجۂ مجذوب کہہ گیا
تیرے دماغ میں ہے خلل، آ کے مجھ سے مل

گیت

شفقؔ سوپوری ایک کامیاب غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ایک منفرد نغمہ نگار بھی ہیں۔ اُن کے گیتوں اور نظموں کا مجموعہ ''بیتے موسموں کا دکھ'' اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں جو بیان کا رچاؤ اور زبان کا رکھ رکھاؤ ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر شفقؔ سوپوری مستقل طور پر گیت

لکھتے تو وہ اپنے وقت کے سب سے منفرد اور ممتاز نغمہ نگار ہوتے۔ ''بیتے موسموں کے دکھ'' میں شاعر نے لسانی اور ہیتی سطح پر کئی تجربات کر کے نہ صرف قدیم ہندوستانی گیتوں کی روایت کو زندہ کر دیا ہے بلکہ بعض اجتہادات سے نظموں کو گیت کے قریب تر کر دیا ہے۔

''بیتے موسموں کا دکھ'' دراصل ایک ایسے جوگی کی پریم کتھا اور جیون کتھا ہے جس نے جیون کو انیک رنگوں میں دیکھا ہے اور جیون کے کال چکر میں روگ دھوگ اور جوگ کو بھوگا ہو۔ یہ شاعر کے اس ازلی سفر کی روداد ہے جس میں پیار محبت کے اصول گیان مارگ تعین کرتا ہے۔ اس راستے کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا راہی جوگ، روگ اور دھوگ کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔ خود شفقؔ سوپوری اس تجربے کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اس ایک لمحے کے سفر سے لوٹ کر میں نے دیکھا تو میری
> جھولی میں صدیوں کی خاک تھی، جسے میں نے برسوں اپنے
> آسن کے نیچے دبا کے رکھا..... لوٹنے پر اس سفر کو زمان و
> مکان کے پیمانے سے ناپ کر میں نے دیکھا کہ میں اپنے ہی
> گھر میں ہوں۔ اور گیان مارگ کی جانب میرے قدموں کے
> نقش ابھی تازہ تازہ ہیں..... سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نقش
> جاتے قدموں کے ہیں یا آتے قدموں کے.....؟۔۱۹

شفقؔ سوپوری کے گیتوں میں یگوں کے گذرنے کی آہٹ بھی ہے، چاندنی راتوں کی شبنمی پازیب کی جھنکار بھی ہے، ساون کی رم جھم میں نین کٹوروں کے چھلکنے کا احساس بھی ہے، برہ کی ماری ہوئی ایک دکھیا آتما کے راتوں کا انتظار بھی..... ایک طرح سے یہ گیت انسان کی آتما کے سفر کے ایک دکھ بھری کتھا ہے:

پگ پگ مجھ کو سونا لاگے، لاگے جھوٹا حکوا، رے
اپنے پرائے مجھ سے بھاگے، لاگے جھوٹا حکوا، رے
رشتے ناطے کچے دھاگے، لاگے جھوٹا حکوا، رے
در در جوگی ٹھوکر کھائے، دھرتی مائی پائے رے
من کا کھویا کیسے پاؤں، جاؤں کس دروازے پر
پاؤں اُن زلفوں کی چھاؤں، جاؤں کس دروازے پر
جوگی بنجارا بن جاؤں، جاؤں کس دروازے پر
سورج جیسا جلتا پتتا، کھوٹا سکّہ جھولی میں
دھونی رمائے چوراہے پر، در در جانا بھول گیا
ساری نگری مارے پتھر، در در جانا بھول گیا
سوکھے پیڑ کا پنچھی بے پر، در در جانا بھول گیا
ایسی کسی پر بن سنے آئے، بن کو جائے بن جارا

شفقؔ سوپوری کے ان گیتوں کے کردار کے گیان کا ماخذ دھرتی ہے اور گیان کا محور اس کا پریتم، اس کے آنسوں اور اس کے روگ ہیں۔ اس کردار کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دھرتی ماں کے اس ابھاگے پُوت کی جیون پونجی وہ کھوٹا سکّہ ہے جو اسے راستے راستے رسوا کرتا ہے۔ آنکھ کا یہ روگی جیون مرن کے اصلی بھید سے ناواقف ہے اور اس کے سوچ کے تٹ پر سپنوں کی چاندنگری کی اپسرا نیل امبر میں چندن روپ کی جھلکیاں دکھاتی ہے جن میں وہ کھو جاتا ہے۔ پھر ایک ایسے بنجارے کی کتھا شروع ہوتی ہے جس کا من نگری میں گھبرا جاتا ہے..... اس کے من کے سونے پیپل پر پت جھڑ کا موسم چھا جاتا ہے اور وہ بھاگ کی ناگن کو اپنے بس میں

کرنے کا منتر سوجھنے کی کوشش کرتا ہے:

راگ الاپے سات سُروں کا، بھاگ کی ناگن اس کی ہوگی
دیکھے گا پاتال گُروں کا، بھاگ کی ناگن اس کی ہوگی
تیرے سائے سورج پوجھا، بوجھا سگرے جگ کو میں نے
تیرا سایا میرا دوجا، بوجھا سگرے جگ کو میں نے
خود کو بوجھا، اُس کو بوجھا، بوجھا سگرے جگ کو میں نے
سیکھی تجھ سے ساری منتر، میرے من کے سونے پیپل

اس سفر کے دوسرے پڑاؤ پر ہماری مڈبھیڑ ایک ایسے پریمی سے ہوتی ہے جس کا دل عشق کے درویش سے کئے گئے وعدے کا پابند ہے، یہ ایک ایسا عاشق ہے جو جیون کے کال چکر میں اپنی مالا کے دھاگے سے سارے جگ کو قید کر لیتا ہے ؎

کچھ نہ بنے جوگی بن بیٹھے
ایسی بات نہیں رے بھائی
ہم نے اتنے تھوڑے دنوں میں
سارے جگ کی خاک اڑائی

ہم نے جو مالا پہنی ہے
اس میں گہرا بھید چھپا ہے
ہم نے تھوڑے سے دھاگے میں
سارے جگ کو قید کیا ہے

وہ پتھر ہو یا ہو وہ موتی
جُڑ جائے تو قیمت پائی

اس عاشق کے دل میں انسان کے جیون کی سب سے انمول پونجی درد ہے، یہ درد کسی چیز کے کھونے کا ہے، کسی سے بچھڑ جانے کا۔ یہ درد پیت کی بازی ہار کر جیتا جاتا ہے ؎

پیت کی بازی کسی نے جیتی
کھیل ہے قسمت کا یہ پیارے
کس دیوانے پر برسے پھول؟
توڑ کے کس نے لائے تارے
قیس ایسے سچّے عاشق پر
لوگوں نے پتھر ہی مارے
(پیت کی بازی کس نے جیتی)

سفر کے تیسرے پڑاؤ پر چاند، شاعر اور جوگی ملتے ہیں اور جیون کتھا کی نئی رچنا رچنے لگتے ہیں۔ یہاں دھرتی ماں کے کومل آنچل میں چلتی ہوئی پُروا اور بہتا ہوا جھرنا جوگی کو لوری سنا کر سپنوں کی نگری میں لے آتے ہیں اور اس پر یہ بھید کھولتے ہیں کہ دانا کی دانائی ہو یا پاگل کی بڑ، سب کا مطلب ایک ہوتا ہے مگر سب کی باتوں کا انداز نرالا ہے۔ اس پڑاؤ پر ایک ایسا کردار سامنے آتا ہے جو ایک رُت میں جوگی ہوتا، ایک رت میں سادھو، اور ایک رت میں دیوانہ ہوتا ہے۔ یہی وہ کردار ہے جو جیون کی حقیقت یوں بیان کرتا ہے ؎

جیون کے بہتے دھارے میں پانی امرت جان کے پینا
جیسے میخانے میں آ کر گنگا جل کی بات ہو پیارے

چوتھے پڑاؤ پر جوگی، سادھو، دیوانہ اور شہزادی مل کر چہار درویش کی اس داستان کو ختم کر دیتے ہیں ؎

تیرے تن کی گھنی شاخوں میں
یاد پرندہ جب اترا تھا
دل کی حویلی کتنی چُپ تھی
جب جنگل میں شور ہوا تھا

دل نے روکا، پھر بھی کہا تھا
جا رے پنچھی جا ہرجائی

فنی اور لسانی سطح پر شفقؔ سوپوری نے ان گیتوں میں کئی کامیاب تجربے کئے ہیں۔ پنگل کی ہیئت میں تخلیق کئے گئے چھندوں کے زیر و بم سے آراستہ ان فن پاروں میں الفاظ کے صوتی آہنگ سے ایک دلفریب گونج پیدا کی گئی ہے مثلاً

پیپل چھیاں کیسے اوڑھوں، دوڑوں تپتی راہوں پر
من کا درپن کیسے جوڑوں، دوڑوں تپتی راہوں پر
کیسے جیون بندھن توڑوں، دوڑوں تپتی راہوں پر
بھٹکوں آوارہ آوارہ، کھوٹا سکّہ جھولی میں

شفقؔ نے ان گیتوں میں ہندی الفاظ کے رسیلے آہنگ سے روانی پیدا کی ہے۔ بقول ڈاکٹر ایوب پریمی:

''شفق سوپوری کے شعری مجموعے'' بیتے موسموں کے دکھ''
میں ہندی کا ایک انوکھا رنگ ہے۔اُن کا تخلیقی شعور کئی
سطحوں پر بے پرواہ ہندی بھاشا خاص کر اودھی اور کھڑی بولی
کے محاوروں کی تشکیل کرتا ہے، ان محاوروں میں مٹھاس کے
ساتھ درد کی ایک ریکھا قاری کے من مین کھینچتی چلی جاتی ہے۔
شفق اُردو کے جدید شاعر مانے جاتے ہیں لیکن جب وہ ہندی
میں لکھتے ہیں تو ان کا ''بن جارا'' من نوگیت (جدید گیت)
میں رمنے لگتا ہے۔اس جوگی من کو انیک پڑاؤں پر رمتے دیکھا
جاسکتا ہے۔اُن کی نظمیں سچ مچ نئے گیتوں میں زیادہ پرکشش
معلوم ہوتی ہیں''۔۲۰

شفق نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے جس لسانی برتاؤ سے کام لیا ہے وہ ان گیتوں کو زمین کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔اور سچ بھی یہی ہے کہ فن زمین سے اٹھتا ہے اور زمین میں ہی پنپتا ہے۔جس فن کے اندر یہ خوبی اور وصف نہ ہو وہ فن کہلانے کا مستحق نہیں۔شفق کی لفظیات دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ قدم قدم پر وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو زمین کے احساس اور آہنگ کے ساتھ جوڑتے ہیں جیسے ماٹی، دھرتی مائی، جگوا، منوا، مکھ، امرت، لیکھا، پیپل چھیاں، من کا درپن، سجن، روگی، بھور، امبر، آشا، رچنا، دھونی، ترست تڑپت، کاسے، سگرے، نیل گگن، وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کا تعلق ہندی زبان کے علاوہ بھوجپوری اور آدی واسی بولیوں سے ہے۔

حواشی

۱: سہ ماہی ''سباق''جموں، مدیر: خالد کرار، شمارہ: ۲

۲: دشت میں دور کہیں، شفق سوپوری، مہدی پبلکیشنز عشہ پیر سوپور، ۲۰۰۷ء، ص ۶

۳: سہ ماہی ''سباق''جموں، شمارہ: ۲

۴: دشت میں دور کہیں، شفق سوپوری، مہدی پبلکیشنز عشہ پیر سوپور، ۲۰۰۷ء، ص ۸

۵: ایضاً

۶: پروفیسر ابوالکلام قاسمی سے نجی گفتگو، ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۷: پروفیسر شہپر رسول سے نجی گفتگو ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۸: سہ ماہی ''سیاق''جموں، شمارہ: ۲

۹: وادی کشمیر کے چند اہم شعراء، جاوید انور، ہمالین ایجوکیشنل مشن سوسائٹی راجوری جموں و کشمیر ۲۰۱۲، ص ۱۸۸

۱۰: دشت میں دور کہیں، شفق سوپوری، مہدی پبلکیشنز عشہ پیر سوپور، ۲۰۰۷ء

۱۱: ایضاً

۱۲: ایضاً

۱۳: کلام فیض کا عروضی مطالعہ، عفیف آفیسٹ پرنٹرس، دہلی ۲۰۱۲ء ص ۵

۱۴: ایک غیر مطبوعہ تحریر

۱۵: دل خاک بسر، از شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۸۹

۱۶: ایک غیر مطبوعہ تحریر

۱۷: دل خاک بسر، شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۸۹

۱۸: وادی کشمیر کے چند اہم شعراء، جاوید انور، ص ۱۸۸

۱۹: بیتے موسموں کا دکھ، شفق سوپوری، مہدی پبلکیشنز عشہ پیر سوپور، ۱۹۹۱ء

۲۰: ایضاً

باب پنجم

شفقؔ سوپوری کی نثری خدمات

کا تنقیدی جائزہ

سرزمین کشمیر صدیوں سے علم وادب کے کارناموں میں پورے عالم میں ممتاز رہی ہے۔ کشمیر میں ابتداء سے ہی علم وادب کی سرگرمیوں نے جِلا پائی ہے۔اس سرزمین پر برہمن دور میں جو علمی وادبی کارنامے انجام دیئے گئے ان کی مثال دنیا کے کسی اور خطے میں بہم ہونا مشکل ہے۔خاص کر سلاطین کے عہد میں کشمیر علم وادب کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔چنانچہ شہمیری دور سے مغل سلاطین کے عہد تک کشمیر میں علم وادب کے فروغ کے لیے وقت کے بادشاہوں نے خاص توجہ دی۔

جہاں تک کشمیر میں تنقید وتحقیق کے کارناموں کا سوال ہے تو اس سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے ساتھ ہی یہاں تنقیدی وتحقیقی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔سرزمینِ کشمیر نے تحقیق وتنقید کے میدان میں ایسی بلند پایہ شخصیات پیدا کی ہیں جن کے کارناموں کے تذکرے کے بغیر اُردو ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔تنقید میں جن مشاہیر نے اپنی فکر اور نظریئے کا سکّہ جمایا ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری سرِ فہرست ہیں۔حامدی کاشمیری نے اگرچہ مختلف تنقیدی نظریات کے تناظر میں کئی اہم موضوعات پر کتابیں تصنیف کی ہیں، تاہم ان کا اصلی اور قابل فخر کارنامہ ''اکتشافی تنقید'' ہے۔اکتشافی تنقید کا نظریہ اُردو میں اپنی نوعیت کا نیا نظریہ ہے جو اپنے اصولوں، منطق اور معیار کے اعتبار سے قابلِ قبول ہے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نظریئے کو قبولِ عام کی سند حاصل ہو رہی ہے۔ حامدی نے تحقیق کے میدان میں بھی کئی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔

حامدی کاشمیری کے علاوہ جن حضرات نے تنقید کے حوالے سے قابلِ قدر کام کیا ہے ان میں پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر نذیر احمد ملک، پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر غلام رسول ملک، پروفیسر امین اندرابی، پروفیسر تسکین فاضل، ڈاکٹر برج پریمی کے

علاوہ ڈاکٹر نذیر آزاد اور ڈاکٹر شفق سوپوری ایسے نقاد ہیں جنہیں اُردو کے اہم نقادوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کئی دہائیوں سے مختلف موضوعات پر تنقیدی جائزے لے رہے ہیں۔ وہ جدید عالمگیر تنقیدی نظریات سے پوری طرح سے واقف ہیں۔ چنانچہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تناظر میں جو ان کی نگارشات منظر عام پر آرہی ہیں وہ انہیں اُردو تنقید کی فہرست میں اعلیٰ اور منفرد مقام پر فائز کرنے کے لیے کافی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قدوس جاوید نے ریاستِ جموں وکشمیر میں تنقید نگاری کا مقام بلند کیا تو بے جا نہ ہوگا۔

اسی طرح تحقیق کے میدان میں پروفیسر اکبر حیدری کا نام اُردو کے اعلیٰ پایہ محققین میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے ساری عمر تحقیقی سرگرمیوں میں صرف کی اور کئی اہم کارنامے انجام دیئے۔ نوجوان نسل میں جو لوگ تحقیق اور تنقید کے میدان میں اپنی فکر کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں ان میں ڈاکٹر شفق سوپوری اور ڈاکٹر نذیر آزاد اہم ہیں۔ فرید پربتی کی جواں مرگی سے وادیٔ کشمیر ایک ہونہار، محنتی اور ذہین شاعر نقاد اور محقق سے محروم ہوگئی۔

ڈاکٹر شفق سوپوری نے یوں تو تحقیق اور تنقید میں کئی اہم اور قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں لیکن ان کی تصنیف ''اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی'' نے انہیں اُردو کے اعلیٰ ادبی حلقوں میں شہرت دوام عطا کی۔ اُردو میں یہ اپنے موضوع پر لکھی ہوئی پہلی کتاب ہے اس کے موضوع کے اختصاص کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس پر شمس الرحمٰن فاروقی نے دیباچہ تحریر کیا ہے۔ فاروقی خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ شاعری اور موسیقی، خاص کر ہماری شاعری اور ہماری موسیقی کا رشتہ بیان کرنا آسان نہیں۔ چنانچہ شفق سوپوری نے اس کتاب میں شعر کی موزونیت اور موسیقیت کے ماخذات پر بحث کر کے شاعری اور موسیقی کے رشتے اور ربط کے محرکات کا سراغ لگایا ہے۔ اسی وصف کی بناء پر شمس الرحمٰن فاروقی نے

یوں لکھا ہے کہ ''ہمارے نوجوانوں میں شفق سوپوری تنہا ہیں جو ان موضوعات پر غور وخوض کرتے رہتے ہیں۔ان کی ایک کتاب ''شاعری،موسیقی اور لسانیات'' کچھ دن پہلے شائع ہوئی تھی اور وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے کچھ اور مسائل بھی اٹھائے ہیں۔خاص کر غزل کے بعض شعراء نے جو بحریں برتی ہیں،اُن کا تجزیہ،ان کی ردیفوں کا تجزیہ،اُن کی پس آمد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشہور مغنیوں کی گائی ہوئی غزلوں کی فہرست اور اس راگ کی صراحت،جس میں وہ غزل گائی گئی ہے،ان سب معلومات نے اس کتاب کو بہت قیمتی بنا دیا ہے۔یہ کتاب ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے''۔۱

شفق سوپوری اس کتاب کی ابتداء میں شاعری اور موسیقی کے رشتے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اعلیٰ شاعری فکر ومعنی کی ندرت اور انفرادیت سے ہی نہیں،ترنم اور موسیقیت سے بھی عبارت ہوتی ہے اور بعض اعتبار سے تو موسیقیت سے ہی شاعری کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ہر قسم کی شاعری موسیقیت کے عناصر کی متحمل ہوتی ہے۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شعر اور نثر کے اثرات میں فرق ہوتا ہے اور اسی موسیقیت کی بنا پر شعر صرف معنویت کا ہی نہیں، کیفیت کا بھی اخراج کرتا ہے۔لہٰذا شعر میں معنوی آہنگ کے ساتھ ساتھ ظاہری آہنگ بھی اہم ہوتا ہے''۔۲

شفق سوپوری اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی کے رشتے کی وضاحت کرنے سے پہلے غزل کی پوری تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے تناظر میں اُردو غزل کی مقبولیت کو اس کے جمالیاتی انداز اور اس کی موسیقیت سے تعبیر کرتے ہیں۔یہی دو عناصر ہیں جنہوں نے اُردو غزل کو عوام کے دلوں کی زینت بنا دیا۔شفق سوپوری یوں فرماتے ہیں:

''غزل اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ اُردو کو فارسی شاعری

سے وراثت میں ملی ہے۔اُردو شاعری میں شروع سے ہی
غزل کی ہیّت ،اس کے اوزان وبحور،تشبیہات واستعارات،
تلمیحات وکنایات،مضامین وخیالات وغیرہ داخل ہو گئے۔
عرب سے ایران ہوتی اور ہندوستان پہنچنے تک اس کو کتنے
انقلابات سے دوچار ہونا پڑا اور بقول کامل قریشی جب یہ طرح
طرح کے ملبوسات بدل چکی تو ہندوستانی پوشاک کی سج دھج
نے اسے کچھ اور ہی بنا دیا''۔ ۳

شفقؔ سوپوری کا نظریہ یہ ہے کہ غزل کو جن عناصر نے ہندوستانی مزاج کے قریب کر دیا ان میں سب سے اہم عنصر ہندوستانی موسیقی ہے۔اور غزل اگرچہ فارسی سے آئی ہے تاہم اُس نے اُردو میں آکر اس کے ان سب لوازمات اور قیود سے صرفِ نظر کیا جو اُردو زبان کے مزاج اور قومی موسیقی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔یہی وہ عمل ہے جس نے غزل کو ہندوستانی کلچر کی ایک مضبوط علامت بنا دیا۔

''اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی''اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مصنف نے غزل کی موسیقیت اور اس کے غنائی عناصر کو ہندوستانی موسیقی کے مزاج کی مطابقت سے دیکھا ہے۔ اپنے تجزیے کی بنیاد شفقؔ سوپوری نے مقتدر شعراء کے کلام کے عروضی مطالعے کے ساتھ ساتھ ردیف وقوافی اور صوتی فضا کی کارفرمائی پر رکھی ہے۔شفقؔ نے میر تقی میرؔ، غالبؔ، اقبال اور حسرت موہانی کے منتخبہ کلام کا تجزیہ کر کے ان اوزان کی نشاندہی کی ہے جو ہندوستانی موسیقی کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں۔اسی طرز پر ردیف وقوافی کا تجزیہ بھی کیا گیا۔

تجزیئے سے قبل ڈاکٹر شفق سوپوری نے شاعری اور موسیقی کے فنون کے آپسی تعلق پر سیر

حاصل بحث کی ہے۔اُن کے خیال میں شاعری اور موسیقی صرف فنکارانہ اظہار کے ہی ابتدائی طریقے نہیں بلکہ ان سے زمانۂ قدیم کے انسان نے عام جذبات اور احساسات کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام بھی لیا ہے۔لیکن دونوں میں واضح فرق یہ ہے کہ موسیقی آواز کا فن ہے اور جب کہ شاعری میں جذبات اور احساسات کی عکاسی کے لیے لفظوں اور ان کے معنی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔شفیق سوپوری نے اپنے نکتۂ نظر کو استحکام بخشنے کے لیے جن مقتدر نقادوں کے نظریات سے استفادہ کیا ہے اُن میں شمس الرحمٰن فاروقی، مغنی تبسم، ایلیٹ، عنوان چشتی، قاضی افضال، صاحب کاشف الحقائق، مجنون گورکھپوری، گیان چند جین، مسعود حسین رضوی، ڈاکٹر بسم اللہ نیاز احمد، ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، پروفیسر سیدہ جعفر، کامل قریشی، سمیع اللہ اشرفی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تجزیات کے باب میں سب سے پہلے ولی دکنی کی سو غزلوں کا عروضی تجزیہ کر کے ان اوزان کی نشاندہی کی ہے جو ولی دکنی نے کثرت سے استعمال کئے ہیں۔شفیق سوپوری نے اس تجزیے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ولی دکنی نے پندرہ اوزان کو کثرت سے برتا ہے۔ان پندرہ اوزان میں جن پانچ کو ولی نے زیادہ استعمال کیا ہے ان کی تفصیل یوں ہے:

(۱) وزن = فاعلاتن مفاعلن فعلن — شرح فیصد: ۲۹

(بحر خفیف مسدس مجنون ابتر مخبون مسکن)

(۲) وزن = مفاعیلن چار بار — شرح فیصد: ۱۲

(بحرِ ہزج مثمن سالم)

(۳) وزن = مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن — شرح فیصد: ۱۲

(بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف)

(۴)وزن=مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن شرح فیصد:۹

(بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف)

(۵)وزن= مفاعیلن مفاعیلن فعولن شرح فیصد:۷

(بحرِ ہزج مسدس محذوف)

اسی طرح کلیات میر سے سوغزلوں کے عروضی مطالعے کے بعد شفیق سوپوری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میر نے تیرہ اوزان کو کثرت سے برتا ہے، اور جن پانچ اوزان کو زیادہ استعمال کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱)وزن=مفعول فاعلات مفاعیل فاعِلن شرح فیصد:۲۲

(بحر مضارع مثمن احزب مکفوف محذوف)

(۲)وزن= فاعلاتن مفاعِلن فعلن شرح فیصد:۱۶

(بحر خفیف مسدس مجنون ابتر/مخبون مسکن)

(۳)وزن= فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن شرح فیصد:۱۳

(بحرِ رمل مثمن مخبون محذوف مسکن)

(۴)وزن= فاعِلاتن فاعِلاتن فاعلاتن فاعِلن شرح فیصد:۷

(بحرِ رمل مثمن محذوف)

بحر مجتث مخبون محذوف اور بحرِ متقارب مثمن سالم کی شرح فیصد بھی سات ہی ہے۔

شفیق سوپوری نے مکمل دیوانِ غالب کے عروضی مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالبؔ نے پندرہ اوزان استعمال کئے ہیں اور سب سے زیادہ حسب ذیل اوزان برتے ہیں۔

(۱)وزن=مفعول فاعلات مفاعیل فاعِلن　　شرح فیصد: ۳۴

(بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف)

(۲)وزن= فاعلاتن، فاعِلاتن فاعلاتن فاعِلن　　شرح فیصد: ۲۹

(بحرِ رمل مثمن محذوف)

(۳)وزن= مفاعِلن فعلاتن مفاعِلن فَعلُن　　شرح فیصد: ۲۸

(بحرِ مجتث مثمن مخبون محذوف)

(۴)وزن= فاعِلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن　　شرح فیصد: ۲۵

(بحرِ رمل مثمن مخبون مُسکّن)

(۵)وزن= مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن　　شرح فیصد: ۲۱

(بحرِ ہزج مثمن سالم)

(۶)وزن=مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن　　شرح فیصد: ۱۴

(بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف)

اسی طرح کلیات اقبال میں کل ۱۱۲ رغزلوں کا عروضی مطالعہ کر کے شفقؔ سوپوری نے ان اوزان کی نشاندہی کی ہے جو اقبال نے غزلوں میں برتے ہیں۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں بحرِ محبث مخبون محذوف (مفاعِلن فعلاتن مفاعِلن فعلن) اور بحر ہزج مثمن سالم (مفاعیلن ۴ بار) زیادہ استعمال کی ہیں۔ نیز اقبال نے غزلوں میں صرف بیس اوزان برتے ہیں۔

تقابلی باب کے تحت ان اوزان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو ولیؔ، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ نے کثرت سے برتے ہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی سامنے لائی گئی ہے کہ کس شاعر نے مقابلے

میں کس شاعر نے کون سا وزن زیادہ برتا ہے۔

جدول نمبر ۶، اس اعتبار سے اہم ہے کیونکہ اس میں مشہور مغنیوں کی گائی ہوئی سو غزلوں کے مطالعہ کے بعد نہ صرف یہ دکھایا گیا ہے کہ ہمارے مغنیوں کو کون سے اوزان میں تخلیق کی گئیں غزلیں راغب کرتی ہیں بلکہ ان راگوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو مختلف موڈ کی غزلوں کے لیے موزون ہیں۔ شفقؔ سوپوری نے اس تجزیئے کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ وہی اکیس اوزان جو ہمارے غزل گو شاعروں کو پسند ہیں، ہمارے گلوکاروں کو بھی انہی میں کمپیوزیشن کرنے میں آسانی ہوئی ہے۔ نیز یہ کہ موسیقاروں نے غزلیں ترتیب دیتے وقت تیور اور مدھم سروں والی راگوں کا خاص التزام کیا ہے۔ اس کے علاوہ کومل سروں پر مشتمل راگوں مثلاً درباری، بھیروی، بھیرو، کھماج، ماروا، پوربی، کافی اور کلیان وغیرہ سے ہی غزلیں منتخب کی ہیں۔

چونکہ بقول شفقؔ سوپوری کے بحر و وزن کے بعد شعر کی موسیقیت کا انحصار ردیف پر ہوتا ہے اور غزل کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ردیف کی موسیقیت ہے لہٰذا انہوں نے ولیؔ، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی غزلوں میں ردیفوں کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہمارے غزل گو شاعروں نے سب سے زیادہ یائے، الف، اور ن کی ردیفیں زیادہ استعمال کی ہیں۔ اور یہی ردیفیں موسیقیت کے اعتبار سے غنائیت سے بھرپور ہیں۔ یائے اور الف سے آلاپ میں وسعت پیدا ہوتی ہے جب کہ ن کی انفی آواز نغمے میں ایک دلنواز کھنک کا عنصر ڈال دیتی ہے۔ ڈاکٹر شفق سوپوری اس ضمن میں فرماتے ہیں:

> ''یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فارسی غزل گو شعراء کے یہاں یہ ردیفیں زیادہ استعمال نہیں ہوئی ہیں۔ دیوان حافظ کے سرسری

مطالعے سے راقم نے دیکھا کہ حافظ نے ''د'' ''ت'' اور ''م''
کی ردیفیں زیادہ برتی ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ
فارسی غزل گو شعراء نے ایسی ردیفوں کا استعمال کیا ہے جو
ایرانی موسیقی کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں''۔ ۴

شفق سوپوری نے آخر پر حسرت موہانی کے کلام کے عروضی مطالعہ اور ردیفوں کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اُردو غزل کے معروف اوزان اور ردیفیں حسرت کو بھی مرغوب ہیں۔ کہتے ہیں:

''جدید غزل میں بھی وہی اوزان برتے گئے ہیں
جنہیں کلاسیقی غزل کا خاصا سمجھا جاتا ہے۔ یعنی دور جدید میں
اگرچہ فکر اور موضوعات کی سطح پر توسیع ہوئی، عروض وہی رہا جو
مروجہ تھا''۔ ۵

اختتامیہ میں شفق سوپوری نے اپنے نظریات، تجزیات اور خیالات کی توثیق کے لیے پورے دلائل پیش کئے ہیں۔ کہتے ہیں:

''وزن کا مقصد ہی شعر میں غنائیت پیدا کرنے کا ہے۔ اگرچہ
کہا جاتا ہے کہ کوئی بحر زیادہ مترنم نہیں ہوتی بلکہ یہ خاصیت ہر
بحر کا حقیقی جوہر ہوتا ہے تاہم کچھ بحریں اور اوزان ایسے ہوتے
ہیں جو موسیقیت یا غنائیت کے لحاظ سے زیادہ مقبول اور
معروف ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنے تجزیے میں دیکھا ہے کہ
اُردو عروض کے مختلف اوزان میں چند ہی ایسے ہیں جنہیں اُردو

شعراء نے بہت برتا ہے اور جن کی غزلیں موسیقاروں نے
کثرت سے گائی ہیں۔ اگرچہ برتاؤ کے لحاظ سے ان اوزان
کی اوسط مختلف شعراء کے یہاں مختلف ہے تاہم یہ اندازہ
درست ہے کہ کچھ ہی ایسے اوزان یا بحریں ہیں جن کا بالعموم
اور کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے''۔٦

شفقؔ سوپوری کثرت سے استعمال ہونے والے جن اوزان کی نشاندہی کی ہے ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) فاعلاتن مفاعِلن فعلن

(۲) مفعول فاعلات مفاعیل فاعِلن

(۳) مفاعیلن ۴ بار

(۴) فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعلن

(۵) مفاعِلن فعلاتن مفاعِلن فعلن

(٦) مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

(۷) فاعلاتن فاعلاتن فاعِلاتن فاعِلن

(۸) فعولن چار بار

(۹) متفاعِلن چار بار

(۱۰) بحرِ میرؔ

(۱۱) فاعلاتن فعِلاتن فعلن

(۱۲) فعِلات فاعلاتن فعِلات فاعلاتن

(۱۳) مفاعیلن مفاعیلن فعولن

(۱۴) مفتعِلن مفاعِلن مفتعلُن مفاعِلن

(۱۵) مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

(۱۶) مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن

بقول شفقؔ اس کے علاوہ ہندی کے کچھ معروف چھندوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اُردو غزل کی نمنائیت اور موسیقیت کا تانا بانا انہی کے تار و پود سے تیار ہوتا ہے۔

وزن و بحر کے بعد ردیف کی کارفرمائی کا جائزہ لے کر شفقؔ سوپوری کا کہنا ہے کہ اُردو میں سب سے زیادہ جو ردیفیں برتی گئی ہیں وہ یوں ہمیں (۱) یائے (۲) الف (۳) ن (۴) و (۵) م۔ کہتے ہیں:

> ''صوتی نقطۂ نظر سے فارسی اور اُردو بحور کی موسیقی کے ذیل کے اجزاء ہیں۔
>
> (۱) طویل مصوتوں کی زیادہ گنجائش
>
> (۲) چھوٹے مصوتوں کی ناگزیر کم سے کم تعداد
>
> (۳) چھوٹے اور طویل مصوتوں کی ترتیب
>
> (۴) مصوتوں اور مصمتوں کا تناسب
>
> اُردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے ایک اور اہم عنصر یعنی آلاپ کی گونا گونی کی شناخت مصوتے کے کثیر استعمال میں کی جا سکتی ہے۔ مصوتے جب ردیف کے آخر میں استعمال ہوتے ہیں تو موسیقار کو آلاپ لگانے میں وسیع امکانات ملتے

ہیں۔ہم نے معلوم کیا کہ اُردو غزل میں زیادہ تر ردیفوں کا اختتام حروفِ علت پر ہی ہوتا ہے جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا یہ عنصر جسے ہم آلاپ یا ایک سُر پر ارتکاز (Melody) کہتے ہیں، اُردو غزل میں ابتداء سے ہی کارفرما رہا ہے۔ یہی نہیں کہ ہمارے غزل گو شعراء نے انہی غزلوں میں زیادہ تر مصوتوں کے استعمال سے کام لیا ہے بلکہ مصوتوں اور مصمتوں کی دل آویز آمیزش سے اُردو غزل کو غنائیت اور موسیقیت کا ایک مرکب بنا دیا ہے''۔ ۷

اس کتاب کے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سیفی سرونجی یوں رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر شفق سوپوری نے اس کتاب میں اُردو غزل اور موسیقی کے ذریعہ ہندوستانی موسیقی پر ہی نہیں ہندوستانی تہذیب کا بھی احاطہ کیا ہے، اس لیے کہ راگ راگنی ہندوستانی تہذیب کی ہی دین ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر شفق سوپوری کی یہ کتاب اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی پر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب کو بھی پیش کرتی ہے۔ انہوں نے ہمارے اساتذہ کے کلام کو عروض اور موسیقی کے حوالے سے جو تجزیہ کیا ہے، وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر شفق سوپوری کا اس کتاب میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اُردو

غزل اور ہندوستانی موسیقی کے حوالے سے ہندوستانی تہذیب
کواُجاگر کیا ہے۔اس کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا ہے۔
یہ ایک بڑے اور سچے محقق ہونے کا ثبوت ہے کہ اس نے
اپنے وطنِ عزیز کی تہذیب کو اعلیٰ سطح، اعلیٰ پیمانے پر اپنے
گہرے مطالعے اور مشاہدے کے ذریعے نمایاں کیا۔جس
موضوع کو چھونے کی بھی لوگ جرأت نہیں کرتے، اس موضوع
پر شفؔق سوپوری نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ادب کی تاریخ میں وہ
ہمیشہ اس حوالے سے زندہ رہیں گے''۔۸

شفؔق سوپوری کی ایک اور معرکتہ الآراء تصنیف ''موسیقی، شاعری اور لسانیات'' ہے۔اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ اُردو میں لکھی ہوئی پہلی کتاب ہے۔یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیل یوں ہے:

(۱) موسیقی کی معنویت
(۲) موسیقی کے عناصر ترکیبی
(۳) موسیقی کی ابتداء
(۴) میلوڑی اور ہارمونی
(۵) موسیقی، جمالیات اور نفسیات
(۶) موسیقی کی جمالیاتی قدر
(۷) موسیقی، شاعری اور لسانیات

جیسا کہ اس کتاب کے مشمولات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شفؔق سوپوری نے پہلے موسیقی کی

معنویت پر بحث کی ہے پھران کے عناصر ترکیبی کی وضاحت کر کے اس کی ابتداء پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد میلوڑی اور ہارمونی کی خصوصیات بیان کر کے موسیقی جمالیات اور نفسیات پر بحث کی ہے اور موسیقی کی جمالیاتی قدر کا تعین کیا ہے۔آخری باب میں موسیقی شاعری اور لسانیات کے رشتے کی وضاحت کر کے اس کتاب کو اس قدر اہم بنایا ہے کہ سیفی سرونجی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ''موسیقی،شاعری اور لسانیات'' ایک مشکل موضوع پر ہے۔شعری مجموعوں کی بھیڑ میں یہ منفرد کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر شفق سوپوری کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔نئی نسل میں اس موضوع پر کسی اور کی کتاب دیکھنے میں نہیں آتی''۔

موسیقی کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے شفقؔ سوپوری یوں لکھتے ہیں:

> ''انسانی تہذیب اپنی ارتقائی صورت میں زبان،مقام،عقائد اور قوم کے نام پر قوس قزح کی طرح پھیلتی ہے۔اس ارتقائی سفر میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب فطرت کی اثر انگیزی اور انسانی جبلتوں کے تحرک کے سبب انسانی بےخودی کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔یہ سرشاری جب ترتیب وتسلسل کے ساتھ اعضائی حرکات کی صورت میں سامنے آتی ہے تو اسے رقص کہتے ہیں۔اور یہی سرشاری جب ترتیب وتسلسل کے ساتھ نغمہ وآہنگ میں ڈھل کر سامنے آتی ہے تو اسے موسیقی کہتے ہیں''۔۹

لفظ موسیقی کے ماخذ کے بارے میں شفقؔ سوپوری نے کئی نظریات کا ذکر کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یونانی ارسطور کے مطابق مشہور ہے کہ یونان میں فنون نو دیویوں کے تابع ہیں۔

انہیں Muses کہا جاتا ہے۔ Music اور Amusement جیسے الفاظ انہیں کے مرہونِ منت ہیں لہٰذا Music کو Muse کا مشق سمجھنا ہی قرینِ قیاس ہے۔ شفقؔ نے موسیقی کی تعریف اور اس فن کی وضاحت میں سائنسی علوم کے تناظر اپنا نقطۂ نظر پورے استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں جن اصطلاحات کا انہوں نے ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر کا تعلق علم طبیعات سے ہے جیسے Magnitude یعنی آواز کا ہلکا بھاری ہونا، Timber یعنی آواز کی کیفیت اور Pitch یعنی آواز کا اونچا نیچا ہونا، Vibration یعنی ارتعاش، وغیرہ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک وسیع اور گہرے مطالعے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔ موسیقی کے فنی عناصر کی وضاحت کرتے ہوئے شفقؔ سوپوری عالمگیر نظریوں سے استفادہ کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''موسیقی تغیر پذیر زیر و بم کی آوازوں کو منظم کرنے اور ترکیب دینے کا فن ہے۔ جس سے مختلف جذبات اور خیالات کی مظہر نغمہ سازی پیدا کی جاتی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے موسیقی میلوڈی، ہارمونی، زیر و بم، وقفوں اور لے کا ایک مرکب نظام ہے۔ موسیقی کے اہم عناصر جنہیں ایک دوسرے سے ممتاز کیا جا سکتا ہے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) میلوڈی (۲) ہارمونی (۳) لے (۴) آواز کی کیفیت۔ اس کے بعد میلوڑی، ہارمونی، لے اور آواز کی کیفیت اور مخصوص کوالٹی پر نہایت ہی مدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ میلوڈی کی تعریف میں شفقؔ سوپوری لکھتے ہیں کہ موسیقی میں میلوڈی سروں کے تواتر کو کہتے ہیں جس سے ایک تفریق پذیر اکائی کی ہیّت وجود میں آتی ہے اور جو بالعموم اظہاری ہوتی ہے۔ عرفِ عام میں میلوڈی کو سروں کی ترکیب کا ایک پُرکشش نظام کہتے ہیں۔ اسی طرح ہارمونی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ موسیقی کی عام اصطلاح میں ہارمونی دو یا دو سے

زیادہ سروں کے بیک وقت بجنے کو کہتے ہیں۔زیادہ باریکی کے ساتھ اگر ہارمونی کی تعریف کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ مغربی موسیقی میں دو یا دو سے زیادہ بجنے والے Sonoritics Chords اور دوسرے سروں کے ملاپ Chords کو حرکت دینے کو ہارمونی کہتے ہیں۔لَے کی تعریف میں کہتے ہیں کہ موسیقی میں لے ان مسلسل جنبشوں کو کہتے ہیں جو میلوڈی یا ہارمونی کے مضبوط یا کمزور ضربوں کے وقوع سے وجود میں آتی ہیں۔لے (تال) ایک طرح سے موسیقی کا سب سے زیادہ بنیادی اور عالمگیر عنصر ہے۔آواز کی کیفیت کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ آواز موسیقی کے لیے اظہار یا ترسیل کا ذریعہ ہے۔سریلی آواز سماعت پر خوش گوار اثر ڈالتی ہے جب کہ شور بالکل بے سرا ہوتا ہے اور سریلی آواز جمالیاتی اپیل کے بغیر ایک بے معنی شے ہوتی''۔۱۰

''موسیقی شاعری اور لسانیات'' میں شفق سوپوری نے موسیقی کی ابتداء پر نہایت معروضی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ان کے خیال میں فنونِ لطیفہ میں موسیقی قدیم ترین فن ہے اور زمین پر مادہ یعنی Matter کے لیے انسانی اور حیوانی حیات کی نمود سے پہلے موسیقی کے عناصر موجود تھے۔لہٰذا موسیقی کائنات کی تخلیق کی ہم عصر رہی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''شیکسپیئر نے وجدانی طور پر محسوس کیا تھا کہ آسمانوں میں سب سے نمودار ہونے والے ستارے نے اپنی حرکت سے موسیقی پیدا کی تھی اور جب تنزل وانحطاط کی مکدر چادر روح انسانی سے لپٹ گئی۔انسان یہ موسیقی سننے سے قاصر رہا۔یہ موسیقی بعینہ وہ ہے جس کی طرف ہندو عارفوں نے اشارہ کیا ہے جسے اناہٹ یا نادر کہا جاتا ہے''۔۱۱

موسیقی کی پیدائش کے بارے میں جو نظریئے موجود ہیں ان پر بحث کرتے ہوئے شفق سوپوری ان میں سے کئی کا ابطال کرتے ہیں مثلاً یہ نظریہ کہ انسانوں نے آبشاروں کے زمزموں، ہوا کی سائیں سائیں اور پانی کے قلقل وغیرہ سے موسیقی اخذ کی ہے۔ اسی طرح ڈارون کے نظریئے سے متاثر ہو کر جو نظریہ قائم کیا گیا ہے اس سے اختلاف کرتے ہوئے شفق سوپوری کہتے ہیں کہ اس نظریئے سے مراد عام جسمانی قانون سے ہے جو موسیقی میں عام قدرتی جبلتوں میں محض نطقی اظہارات کو جنس کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

جیسا کہ پرندوں کی دنیا میں گیت کو جنس سے تعبیر کر کے کہا جاتا ہے کہ گیت پرندوں کے جنسی اختلاط کے موسم کے دوران میں جنسی جوش کی ایک علامت ہے اس لیے انسانوں میں بھی گیت یا موسیقی کی ابتداء بھی جنسی محبت کے عمل میں ہو جاتی ہے۔ اس نظریئے کی در میں شفق سوپوری یہ دلیل پیش کرتے ہیں:

> ''اس نظریئے کے طریقِ عمل یا جدتِ خیال کی بنیاد غیر صحیح ہے۔ یہ دونوں مفروضے اس حقیقت سے متضاد ہو جاتے ہیں کہ پرندے جنسی اختلاط کے موسم کے بغیر بھی گاتے ہیں۔ پرندے کھیل کود کی جبلت کے زیر اثر بھی آوازیں نکالتے ہیں اس لیے یہ فرض کرنے کے بعد کہ موسیقی کا مخرج انسانی جبلتوں میں ہے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مقررہ اور قابلِ ردوبدل نغمے کیوں اتنے اہم تھے اور وحشی قبائل کے گیت وضع کے طور پر عشقیہ گیت کیوں نہ تھے''۔ ۱۲

اسی طرح سے ڈاکٹر شفق سوپوری کے خیال میں نقالی کا نظریہ بھی غیر معروضی ہے جس کی رُو

سے کہا جاتا ہے کہ حیوانی گیت موسیقی کی قدیم ہیّت ہے اور انسانوں نے غیر مترشح وجہ سے پرندوں کی نقالی کی ہے۔ اس خیال کو اس حقیقت سے تقویت دی جاتی ہے کہ پرندوں کے گیتوں کو ہماری موسیقی کی طرزوں کے نظام میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شفقؔ سوپوری کہتے ہیں کہ اس نظریئے کا ابطال یہ حقیقت کرتی ہے کہ پرندے اپنی آوازوں یا ان کو سکھائے گئے سبق کو دوسرے سُر میں تکرار نہیں کر سکتے حتیٰ کہ یہ اپنی آواز کو کسی سُر میں بھی نکالنے سے قاصر ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''موسیقی فی الحقیقت اس وقت جنم لیتی ہے جب کوئی زندہ تخلیق جبلت اور جذبات سے مغلوب نہ ہو بلکہ کچھ مقررہ ارادے اور شعوری عوامل ان کو جاننے اور سمجھنے کی طرف لے جانے والے وجدان سے بعض مقاصد کی تقلید کریں۔ انہی بلاواسطہ ارادوں کو سارے انسانی کلچر اور تہذیب کی شرط اول مانا جاتا ہے اور یہی موسیقی کو حیوانی دنیا کی پکاروں اور آوزوں سے ممیز کرتے ہیں''۔ ۱۳

ڈاکٹر شفق سوپوری کے بقول موسیقی کی پیدائش کے لیے قدیم ترین تاریخ کے پر پیچ دور سے گذرنا اور اس عہد کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جب آدم زاد حیوانیت کے چولے اتار کے ایک بھرپور مہذب زندگی گزارنے کی طرف محوِ سفر تھا کیونکہ موسیقی کی کہانی انسانی ذہن کی ترقی اور تخیل کی توسیع کی تاریخ ہے اور موسیقی کی قدیم تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس نے وقت کے نام ودر میں سحر انگیز ممکنات کی یافت کا عمل کیا ہے۔ شفقؔ سوپوری کے نظریے کے مطابق موسیقی گانے سے شروع ہوئی۔ انسان نے اپنی آواز کو طبیعی ہیّت دینے کے لیے دو مختلف اور متضاد

وسائل دریافت کئے۔ پہلا چیخ و پکار جو خطرہ و آفت کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ غصہ، محبت، جوش، جذبہ، رنج و ملال اور طیش وغیرہ کے فطری اظہار پر دلالت کرتا ہے۔ سوپوری کے خیال میں یہی وہ طریقہ ہے جس سے انسان کے صوتی لب نے رفتہ رفتہ تقلیدی آوازوں کو خارج کرنے کا عمل سیکھا۔ ان آوازوں کی نوعیت ابتداء میں میکانکی تھی۔ فرماتے ہیں:

''الفاظ سے بے بہرہ انسان نے الحانی آوازوں کو جمع کرتے ہی ڈھول کی ٹھاپ اور ہاتھوں کی تال کی اہمیت بھی محسوس کی جن سے انسانی ذہن کو آوزوں کی طرف مائل کرنے میں یا باالفاظ دیگر زیر و بم کی مدد حاصل ہوسکتی تھی۔ تجربے سے اس نے سیکھا کہ الحانی آوازوں کے نشیب و فراز کی تبدیلی سے نہ یہ کہ ان میں کچھ کو دوسروں سے الگ کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کو متغیر بھی بنایا جاسکتا ہے۔ زبان کی مکمل ترقی سے پہلے بھی لوگ گاتے تھے اور ان کے پاس کچھ سُر تھے جن کی ترتیب سے وہ الحانی گیت گائے جاسکتے تھے جو ان کے جذبے کو اظہار کر سکتے۔ جیسے ہی کلمے ایجاد ہوئے تو نشیب میں تھرتھراہٹ اور فراز میں شور پیدا ہوا۔ یہ ایک جذب زادہ اور باقاعدہ عمل تھا''۔ ۱۴

یہاں ایک اور اہم نکتے کی طرف شفیق سوپوری نے اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ ابتدائی زبان کے ماہروں نے ایک مختصر اور سادہ متن یکے بعد دیگرے دوسروں کے درمیان ایک طرز میں ڈھالا۔ یہ دونوں سُر مختلف مقامات اور مختلف قبائل میں منفرد ہوتے تھے۔ اس سے قدیم

انسان کو محدود اور متعین وقفوں کا علم ہوا جن کے استعمال سے آگے چل کر وہ سُر دریافت ہوئے جن سے موسیقی کی سرگم کی بنیاد پڑ گئی۔

ایک اور اہم بات جو ڈاکٹر شفق سوپوری کہتے ہیں یہ ہے کہ دوسرے فنون کے مقابلے میں موسیقی ایک ناموافق صورت حال سے دوچار رہی کیونکہ عناصرِ فطرت میں موسیقی کے لیے کوئی مثالی نمونہ موجود نہ تھا کیونکہ سارے فنون یا تو تمثیلی ہیں یا پھر نقل۔ موسیقی بمشکل اپنے لیے کوئی ایسا نمونہ پا سکی جو اسے سرگرم کالونی مربوط ڈھانچہ تجویز کر سکتا ہے۔ اسی لیے موسیقی اپنے وجود کی بقا کے سہارے کے لیے غیر موسیقانہ عناصر تال اور الفاظ وغیرہ کی طرف مائل ہوگئی۔

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے شفق سوپوری اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تال دھن کے مقابلے میں اپنے اندر زیادہ استحکام اور قطعیت کی حامل ہے۔ شاید اسی وجہ سے مناسب یا موزون ڈھانچہ موسیقی کی پہلی فارم ہے جس پر وہ اپنی ترکیب بندی کرتی ہے اور اپنے آپ کو باضابطہ اور متعین بناتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''موسیقی میں تال ایک واحد نمونہ اور چست نظام وزن ہے جس پر گایا جا سکتا ہے، رقص کیا جا سکتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ فنِ موسیقی کی ایک غیر مکمل حالت کی ایک بنیاد اور ڈھانچہ ہے جس میں وزن کے تقاضوں کے پیش نظر باتوں کی ترنگنے بعد کے ''لے'' میں پڑھنے (Chanting) کی بنیاد ڈالی۔ یہی عالمگیر سطح پر کانی موسیقی کی ابتداء ہے''۔ ۱۵

اس کتاب کا ایک اور اہم باب بعنوان ''میلوڈی اور ہارمونی'' ہے جس میں ہندوستانی اور

مغربی موسیقی کے بنیادی عناصر پر بحث کی گئی ہے۔ میلوڑی یعنی ایک سُر پر ارتکاز دراصل ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کی بنیادی شناخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی موسیقی کے آلات زیادہ تر انفرادی طور پر بجائے جاتے ہیں۔ اس عنصر کو قدیم ہندوستانی کے لوگوں کے عقائد کا ایک حصہ مان کر ڈاکٹر شفق سوپوری یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان میں وقت قدیم سے موسیقی کو نروان اور نجات پانے اور مقدس چیزوں تک رسائی کے لیے بہترین ذریعہ مانا گیا ہے۔ نجات کا طالب اس راستے کا واحد اور تنہا مسافر ہے اور وہ انفرادی طور پر موسیقی کو ذریعۂ نجات پاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہندوستان میں نہ کوئی سمفنی اکسترا ہے، نہ کوئی اوپیرا اور نہ گروہی موسیقی جو عام طور پر مغرب میں مروّج ہے۔

میلوڈی کی تعریف میں شفق سوپوری کہتے ہیں کہ اس میں ہر سُر انفرادی طور پر سنا جاتا ہے اور جب بدلتے اندازوں سے سُر سبک یا تیز رفتار تواتر میں آتے ہیں تو خوشگواری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہارمونی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ ہارمونی تین سریلی آوازوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جنہیں ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے بیک وقت سجایا جاتا ہے۔ یہاں ایک اہم نکتے کی وضاحت شفق سوپوری ان الفاظ میں کرتے ہیں[۱]:

> ''(ہارمونی میں بھی) میلوڈی کی طرح اگرچہ سُر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں مگر جیسا کہ میلوڈی میں متواتر سروں کا طلسمی نظم ہوتا ہے یہاں انہیں متوازن نظم میں رکھا جاتا ہے اس لیے جب تک ایک مغربی سامع اپنی ہارمونک تنظیم یا ہیّت کو فراموش نہ کرے وہ ہندوستانی موسیقی سے مانوس نہیں ہوسکتا۔ بالکل اسی طرح ہندوستانی سامع جو مغربی موسیقی

سے نا آشنا ہو رہا رمونک سمفونک خیال سن کر حیران ہو جائے گا
چونکہ وہ اس طرز کی موسیقی سے نامانوس ہے اس لیے اس کے
کانوں کو یہ موسیقی سماعی تاثرات کے مختلف گڈ مڈ ہوتی ہوئی
مخلوط آوازوں کا مجموعہ لگے گی''۔۱۶

میلوڈی اور ہارمونی کے آپسی رشتے اور ان کے بیچ امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے شفق سوپوری فرماتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی ہارمونی کے اصول پر قائم ہے لیکن یہ اپنے نمائندہ میلوڈیانہ خصوصیت کی حامل ہونے کے باعث سروں کی نغمگی مسترد کرنے والے تاروں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جہاں مشرقی موسیقی کی محدود ہارمونی مغربی سامع کو کمزور اور خفیف معلوم ہو، وہاں مغربی موسیقی کی صاف اور شستہ ہارمونی مشرقی سامع کی میلوڈی کو غارت کرنے والی ایک ہنگامہ خیز شئے محسوس ہوگی کیونکہ میلوڈی ہندوستانی موسیقی کی روح ہے۔

''موسیقی، جمالیات اور نفسیات'' کے عنوان سے شامل باب میں شفق سوپوری نے معروضی بنیادوں پر موسیقی جمالیات اور نفسیات کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ ان کے آپسی تعلق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شفق سوپوری موسیقی کا نظریہ یہ ہے کہ موسیقی کی جمالیات کے لیے کوئی بھی نظریہ چاہے وہ کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو نفسیاتی نقطۂ نظر سے صرف نظر کر کے موسیقانہ تجربہ پر بحث نہیں کر سکتا ہے۔ جمالیات اور جمالیاتی ترسیل کے بارے میں ان کا یہ نقطہ نظر ہے کہ جمالیات اپنے آپ کو فن پارے کے حسن میں ظاہر کرتی ہے اور یہی حسن فنکار کی تخلیقی قوت اور اثر پذیر سامع کے جمالیاتی تجربے سے ایک جمالیاتی شئے بن جاتا ہے۔ جمالیاتی ترسیل کے دو ذرائع ہیں، جمالیاتی طور سے حساس شخص اور فن پارہ۔ ان میں دو سے جمالیاتی ترسیل ہوتی ہے۔ اس لیے فن تک رسائی کے دو راستے کھل جاتے ہیں، نفسیات اور

مظہر یات۔شفقؔ سوپوری اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

''خاص نفسیاتی رسائی کے ذریعے ہم داخل کے ہر ایک عمل پر ردعمل کرتے ہیں اور موسیقی کے لطف وادراک کے براہِ راست تجربے سے باشعور ہوجاتے ہیں۔مظہر یاتی رسائی میں ہمارتوجہ فن اور اس کی اہمیت، ترکیب وتعمیر کے طریقوں او ران داخلی قوتوں پر مرکوز ہوتی ہے جو فن پارے میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے''۔۱۷

جمالیاتی تجربے کے نتیجے میں شعور کے عمل کو جمالیاتی کیف کے قریب لانے اور حاصل شدہ تجربات کو عام نفسیاتی بنیاد فراہم کرنے کے سلسلے میں شفقؔ سوپوری کے نزدیک جو قوت کارفرما رہتی ہے اسے داخلی نفسیاتی وضع کہتے ہیں جو نفسیاتی جمالیات کی تہہ میں موجود ہوتی ہے اور جس کا عمل دماغ یا دماغی مظاہر میں حس پیدا کرنے کی وجہ بن جاتی ہے۔اسی سے کیفیت مزاج اور جذبات اور ان خیالات کا تجربہ ہوتا ہے جو فن پارے پر دھیان دیتے وقت اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مہم میں ابھرتے ہیں۔

اس کے بعد شفقؔ سوپوری یونانی لذت پسندوں کے نظریہ کے تناظر میں افلاطون کے اس نظریے پر روشنی ڈالتے ہیں جس کی رو سے فن روح کو بلند فضاؤں کے بجائے حلقۂ احساس تک محدود رکھتا ہے اور فن کارانہ عمل کا احساساتی کیف سے کوئی تعلق نہیں۔شفقؔ سوپوری اس نکتے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ افلاطون کا خیال نفسی مادہ کو روحانی تعلق سے ممیز کرتا تھا۔اور افلاطون کے نظریات کی صحیح تشریحات کی خاطر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اس دور میں موسیقی کو سب فنون پر سبقت حاصل تھی۔یونانیوں نے موسیقی کو قطعی عظیم الہام تصور کیا تھا۔

ان کے نزدیک موسیقی کائنات کی جملہ تخلیقی قوتوں کی مظہر تھی۔اس کے بعد شفق سوپوری نے ارسطو، فلاطینس، کانٹ، Reverse، Francis J. Coleman وغیرہ کے نظریات پر پوری تفصیل سے مدلل بحث کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دوسرے فنون کے مقابلے میں موسیقی کے تخلیقی سوتے جو زیادہ گہرے اور پنہاں ہوتے ہیں ایک ایسی فضا سے خروج کرتے ہیں جس میں فرد اور اجتماع ایک غیر منقسم ترکیب پاتے ہیں۔خود عظیم اساتذۂ موسیقی کے فن پارے بھی ان مخصوص خیالات، ہیجانات اور تمناؤں کے حامل ہیں جن کی جڑیں اجتماع میں پیوستہ ہوتی ہے۔اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ موسیقی نہ صرف فن کارہائے موسیقانہ خیالات کی مظہر ہے بلکہ یہ ان اجتماعی مقاصد کو بھی ظاہر کرتی ہے جو اس کی پیدائش اور ترتیب میں برابر معاون ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ زندگی کی لے اور رفتار کے علاوہ روح کی آوازیں اور میلانات بھی جو حاشیہ شعور میں بھی داخل نہیں ہوتے، موسیقی میں بیان ہوتے ہیں۔

شفق سوپوری نے اس کتاب میں موسیقی کی جمالیاتی قدر کے تعین میں چند اہم مغربی نظریہ سازوں سے استفادہ کیا ہے۔دراصل شفق سوپوری کا نظریہ یوں ہے کہ موسیقی کی اہمیت اور افادیت کا تعلق جمالیاتی تسکین سے گہرا ہے۔ان کے خیال میں موسیقی کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں قدیم نظریہ سازوں نے نہایت سطحی اور غیر منطقی باتوں کا اظہار کیا ہے۔دیوتاؤں کو خوش کرنے یا عبادات میں انہماک پیدا کرنے کے ایک ذریعے کے طور پر موسیقی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سوپوری کہتے ہیں کہ اس طرح موسیقی کی بنیادی حیثیت مشکوک اور محدود ہو جاتی ہے۔اس کے بعد موسیقی کے بارے میں افلاطون کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہوئے شفق کہتے ہیں کہ دراصل افلاطون کے فنون کی آزادی

سلب کرنے کی تجویزیں تیار کی تھیں۔

شفق سوپوری نے موسیقی کی جمالیاتی قدر کے سلسلے میں ارسطو سے لیکر فلوڈیمس، فلاطینس، ہیگل، آرتھر شوپنہار، لینگر، کارل مارکس، فریڈرک اینگلز، ایڈورڈ ہینسک، کلایو بیل، سارتر، ویٹ گن اشٹائن، فرائڈ، ہربرٹ ریڈ، وغیرہ مفکرین اور نظریہ سازوں کے نظریات پر مکمل اور مدلل بحث کر کے اپنے نقطۂ نظر کو مستحکم اور معروضی بنیادوں پر کھڑا کر کے موسیقی کی جمالیاتی قدر کی وضاحت کی ہے۔ اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ شفق نے کس دقیق نظر سے قدیم زمانوں سے الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھایا ہے۔

اس کتاب کا آخری باب ''موسیقی، شاعری اور لسانیات'' موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم ہے کیونکہ اس موضوع پر ابھی تک مشرقی مفکرین اور نظریہ سازوں نے کوئی خیال ظاہر نہیں کیا ہے۔ اس باب میں شفق سوپوری نے شاعری کے تخلیقی عمل، وجدان کے تاثرات سے پیدا ہونے والے سریلے ارتعاش، جذبات اور تخیلات کے امتزاج جیسے دقیق نکتوں پر مدلل بحث کر کے موسیقی اور لسانیات کے رشتے کا سراغ نکالا ہے۔ شفق سوپوری کا کہنا ہے کہ یونانیوں نے قدیم زمانے سے ہی یہ تسلیم کیا ہے کہ لسانی ساخت اور موسیقی کے مابین قریبی تعلق ہے۔ چونکہ موسیقی اور زبان ''معنی'' کو اظہار کرنے کے وسیلے ہیں اور ان دونوں کا تعلق سامعین سے ہے اس لیے قدیم ترین یونانیوں نے یہ تصور قائم کیا کہ موسیقی انسان کے جذباتی اور اخلاقی نقطہ نظر پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ڈاکٹر شفق سوپوری موسیقی اور زبان کے درمیان پائے جانے والے فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ لسانی ساخت میں تمام معنویات اور اکثری نحوی جزئیات کے لغوی معنی ہوتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ خارجی دنیا کی مخصوص اشیاء یا صفات سے ان کا کس طرح کا حوالہ ہے جس کی وضاحت اگرچہ کلی طور پر یا

اکثر اوقات کے مطلق اختصار کے ساتھ نہیں ہوسکتی تاہم کسی حد تک عام ضروریات کے تقاضوں کے مطابق ہوسکتی ہے۔موسیقی میں البتہ اشارے نہیں ہوتے۔میلوڈی یا ہارمونی کے تواتر یا آلاتی دھن وغیرہ سب رمزی ہوتے نہیں۔مزید یوں فرماتے ہیں:

''موسیقی اور زبان میں شدت اور طوالت میں ممکنہ اختلافات کے ساتھ متواتر اور مختلف زیر بموں کا استعمال مشترکہ ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ لسانی ساخت کے عروضی پہلو وہی ہوں گے جو موسیقانہ ساخت کے ساتھ قریبی مطابقت رکھتے ہیں''۔۱۸

لسانی اور موسیقانہ ساختوں پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر شفیق سوپوری یہ نتیجہ اخذ ہر کرتے ہیں کہ لسانی اور موسیقانہ ساختوں میں اس حد تک مطابقت دیکھ کر توقع کی جاسکتی ہے کہ ان دونوں کے مابین کچھ رشتہ موجود ہوگا۔چنانچہ بقول ان کے ۱۷ویں صدی کے آغاز سے ہی اس رشتے کے بارے میں نظریات وجود میں آگئے اور کچھ نظریہ سازوں نے ان میں معقول وضاحت کے ساتھ اضافے بھی کئے ہیں۔

اس ضمن میں ڈاکٹر شفیق سوپوری فرانس کے کمپوزر Philoppe Rameau اور دیگر ایسے نظریہ سازوں کے ایسے خیالات کا ذکر کیا ہے جو اس بنا پر رد کئے گئے ہیں کہ انہوں نے لسانیات سے موسیقی کی طرف رجوع نہ کیا بلکہ موسیقی کے آسانی سے قابل تجزیہ حقائق سے آغاز کر کے لسانیات کی طرف گئے۔شفیق سوپوری ایک اہم نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

''ایک موسیقار زبان کے بنیادی عروضی نمونوں اور بول چال

کی زبان سے متاثر ہوکر ہی بہترین ترتیب کاری کے فرائض
انجام دے سکتا ہے۔علی ہذاالقیاس ایک شاعر کے لیے
ضروری ہے کہ وہ موسیقی کے رموز سے (کماحقہٗ) آگاہی
حاصل کر کے آہنگ کے حقیقی جواہر میں حسن پیدا کرے''۔۱۹

اس نکتے کی وضاحت اور اپنے نقطۂ نظر کی توثیق کے لیے شفیق سوپوری ٹی ایس ایلیٹ کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں:

''جب ہم اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں فقری محاورہ کو
مضبوط کیا جاسکتا ہے تو اس کے بعد موسیقانہ جامعیت کا دور
شروع ہوسکتا ہے۔لیکن یہ بات تو میں بھی نہیں جانتا کہ اس
سلسلہ میں موسیقی کے کتنے فنی علم کی ضرورت درکار ہوگی کیونکہ
وہ فنی علم خود میرے پاس بھی نہیں ہے۔لیکن اتنا ضرور جانتا
ہوں کہ وہ خصوصیت جس کا تعلق شاعری سے بہت قریبی ہے
وہ اوزان،لحن اور ساخت کے ادراک وشعور سے تعلق رکھتی
ہے۔میرا خیال ہے کہ شاعر کے لیے تو ممکن ہے کہ وہ موسیقی
سے بہت قریب ہوکر اپنا کام کرے۔ہوسکتا ہے کہ ایسے
میں تصنع کا اثر پیدا ہوجائے لیکن میں اس بات سے واقف
ہوں کہ ایک نظم یا نظم کا ایک بند اس سے قبل کہ وہ لفظوں کے
ذریعہ اظہار پائے، پہلے کسی مخصوص لحن کی شکل میں شاعر کے
ذہن میں ابھرے اور پھر یہ لے، یہ لحن کسی خیال یا امیج کی

پیدائش کا موجب بنے اس بات کے اظہار سے میرا مطلب
یہ نہیں کہ یہ کوئی ایسا تجربہ ہے جو صرف میرے ساتھ مخصوص
ہے، ایسی شاعری کے امکانات بھی موجود ہیں جو کسی موضوع کو
پیش کرتے وقت مختلف سازوں سے مماثلت رکھتی ہو۔
شاعری میں موضوع سخن کو گمکی کی ترتیب سے پیش کرنے کے
امکانات بھی موجود ہیں''۔ ۲۰

کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ

یہ بھی شفق سوپوری کی ایک معرکتہ الآراء تصنیف ہے جس میں فیض احمد فیض کے تمام دستیاب کلام کا عروضی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں رفیق راز یوں فرماتے ہیں:

''زیرِ نظر کتاب میں شفق سوپوری نے ایک اور مشکل موضوع کو
چھیڑا ہے۔ کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ پڑھ کر میں اس نتیجے پر
پہنچا کہ شفق نہ صرف شاعری اور فنِ موسیقی کے رموز سے کمال
درجہ واقفیت رکھتے ہیں بلکہ علمِ عروض پر بھی انہیں غیر معمولی
دسترس ہے،،۔ ۲۱

اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رفیق راز کہتے ہیں کہ فیض کی نظموں اور غزلوں کی مقبولیت کا واسطہ اس آہنگ سے ہے جو انہیں عروج سے حاصل ہوا۔ جس زمانے میں فیض نے نظم لکھی اس زمانے کا قاری ابھی غزل کے سحر سے نہیں نکلا تھا۔ لہٰذا فیض نے نظم کی تخلیق میں انہی عناصر کی طرف رجوع کیا جو غزل کی روایت اور اس کی رسومیات سے تعلق رکھتے

ہیں۔ان میں سب سے بڑا عنصر غنائیت کا ہے جس نے صدیوں تک غزل کے جادو کو برقرار رکھا۔رفیق راز آگے فرماتے ہیں کہ فیض نے اپنی نظم کو آہنگ کے ذریعے غزل کے قریب لا کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا اور فیض نے اس آہنگ کو استوار بنانے کے لیے نہ صرف عروض سے مدد لی بلکہ اپنی نظموں میں وہی ڈکشن استعمال کیا جو غزل کا خاصا ہے۔اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ اردو نظم کو لسانی ساخت پر جو کچھ فیض نے دیا وہ کسی اور شاعر سے نہ ہوگا تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔فیض نے ارکان کی تخفیف وتزائید سے اپنی نظموں میں وہ آہنگ پیدا کیا جو غزلوں کا نہ ہو کے بھی غزلوں کے جیسا ہے۔شفیق سوپوری نے فیض کی اس فنکارانہ صلاحیت کو گہرائی سے جانچ کر اُن کے کلام کا عروضی مطالعہ ہے۔

خود شفیق سوپوری اس کتاب کی ابتداء میں کہتے ہیں کہ میں فیض صاحب کی فنکارانہ عظمت اس لیے بھی مسلّم تصور کرتا ہوں کیونکہ انہیں اوزان وبحور اور الفاظ کی غنائیت کا علم ودیعت ہوا تھا۔فکر کی پہلو سے قطع نظر فنی نقطۂ نظر سے ان کے کلام میں بعض ایسی خصوصیات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو انہیں دیگر ترقی پسند شعراء سے ممتاز بناتی ہے اور یہ کہ کلام فیض کی غنائیت نے اس کی مقبولیت میں اہم رول ادا کیا ہے۔

شفیق سوپوری کی یہ کوشش اس اعتبار سے بھی قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے فیض کی جملہ نظموں اور غزلوں کا مصرعہ بہ مصرعہ عروض مطالعہ کر کے اس موضوع کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں کے لیے راستہ ہموار کر کے رکھا ہے۔فیض کی شعری تخلیقات کا عروضی مطالعہ کرنے سے پہلے شفیق سوپوری نے ان اوزان وبحور کی نشاندہی کی ہے جن میں یہ تخلیق ہوئی ہیں۔غزل یا نظم کے عروضی مطالعے کے دوران بحروں کی محذوف صورتوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔اس کے علاوہ شفیق سوپوری نے ان ہندی اوزان کا ذکر بھی کیا ہے جو بعض اُردو

بحروں کے مماثل ہیں۔

شفیق سوپوری نے محض عروضی مطالعے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض موقعوں پر کسی اہم نکتے پر بھرپور بحث کر کے کسی بھی طرح کے اشکار کو دور کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ اس دوران انہوں نے بحروں کے تفاعل پر بھی بحث کی ہے۔ مثال کے طور پر فیض کی نظم شورشِ بربط و نے'' کے عروضی مطالعے میں یوں فرماتے ہیں:

> ''اس نظم کا آہنگ بحرِ متدارک مثمن مضاعف مخبون (مقطوع) اور بحرِ متقارب مثمن مضاعف اثلم کے مختلف اجتماعات پر مشتمل ہے۔ یہ آہنگ ہندی کے سمّان سوّیا اور مت سویا چھندوں کے مماثل ہے''۔ اس آہنگ کو پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی نے فنِ شعر و شاعری اور روحِ بلاغت میں بحرِ متدارک مخبون (سولہ رکنی) کے زمرے میں رکھا ہے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کے بقول ہندی کے متذکرہ بالا سوّیا چھندوں کے اوزان و آہنگ میں مشتمل بحرِ متدارک یا بحرِ متعارب کے مزاحف ارکان پر مشتمل اوزان سے ہم آہنگ کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر دشواری پیدا ہو جاتی ہے..... پروفیسر گیان چند جین کے مطابق بحرِ متدارک کے کئی نام ہیں لیکن ان میں متدارک ہی سب سے زیادہ مشہور و مقبول نام ہے''۔ ۲۲

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شفیق سوپوری نے عروضی مطالعے کے دوران کس

قدر محنت کی ہے اور کار آمد نتیجے برآمد کئے ہیں۔ اسی طرح بحرِ میر پر بحث کرتے ہوئے شفیق سوپوری یوں فرماتے ہیں:

''اس کا آہنگ ہندی کے ککھ چھند، لاونی چھند اور گوپی ولبھ چھند کے مماثل ہے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی نے اپنی کتاب ''اُردو اور ہندی کے جدید مشترکہ اوزان'' میں تیس رکنی اوزان کے تحت اس پر بحث کی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اسے بحرِ میر کا نام دیتے ہیں۔ فاروقی درس بلاغت'' میں بحرِ متقارب مثمن اثرم، اثلم، ابتر کے ذیل میں مظفر علی اسیر کا یہ مصرعہ درج کرتے ہیں ع

گیسو و رخ کا بوسہ دے، چاند گہن ہے صدقہ دے

اور فرماتے ہیں کہ یہ بحرِ میر کا بنیادی وزن ہے۔ لیکن میر نے اسے مضاعف یعنی شاتر دہ رکنی استعمال کیا ہے.....''۔ ۲۳

شفیق سوپوری علمِ عروض پر کس قدر کمال کی دسترس رکھتے ہیں اس کا اندازہ فیض کی نظم ''اے شام مہرباں ہو'' کے عروضی تجزیے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''اس نظم میں فیض احمد فیض نے کئی بحریں ایک ساتھ استعمال کی ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ایسا آپ نے شعوری طور پر کیا ہے یا لاشعوری طور پر۔ بہر حال اس نظم کے مختلف اوزان استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں بحرِ مضارع، کہیں بحرِ ہزج، کہیں

بحرِ بدیل تو کہیں بحرِ عمیق۔ مجموعی طور پر اس نظم کا کوئی بنیادی
وزن یا آہنگ نہیں ہے''۔ ۲۴

اور نظم ''پھول مُرجھا گئے سارے'' کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں:

''میرے پیشِ نظر فیضؔ کا کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' ہے جس کے
صفحہ ۶۱۵ پر یہ نظم درج ہے۔ دوسرا مصرعہ: ''تھمتے
نہیں ہیں آسمان کے آنسوؤں'' وزن سے خارج ہے۔ اغلب
ہے کہ کاتب سے کوئی غلطی ہوگئی ہو''۔ ۲۵

ایسی کئی مثالیں اس کتاب سے پیش کی جاسکتی ہیں جن سے واضح ہوجاتا ہے کہ شفقؔ سوپوری نے کلامِ فیض کے عروضی مطالعے میں کسی دقت نظری سے کام لیا ہے کتاب کے آخر پر شفقؔ نے فیض کے تمام مجموعہ ہائے کلام کے عروضی مطالعے کی جدول تیار کی ہے اور ان اوزان کی نشاندہی کی ہے جو فیض کے استعمال کی ہیں۔ مثال کے طور پر نقشِ فریادی کے اوزان کی مندرجہ ذیل جدول:

''نقشِ فریادی (بشمول اشعار برصفحہ ۳۶)

غزلیں: ۱۴

کیفیت اوزان:

۱۔ فاعلاتن مفاعِلن فعلن : ۷ بار

۲۔ مفاعیلن ۴ بار : ۲ بار

۳۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعِلن : ۲ بارے

۴۔ مفاعِلن فعلاتن مفاعِلن فَعلُن : ۱ بار

۵۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن : ۱بار

۶۔ فعولن چار بار : ۱بار

کل : ۱۴

نظمیں: ۳۳ (نظم تین منظر کے تینوں حصوں کو انفرادی نظمیں مان کر)

کیفیت اوزان:

۱۔مفاعِلن فعلاتن مفاعِلن فعلن : ۶بار

۲۔مفعول مفاعیلن : ۱بار

۳۔ فعولن چار بار : ۲بار

۴۔مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن : ۱بار

۵۔مفاعیلن چار بار : ۳بار

۶۔فاعِلاتن فعلاتن فعلاتن فعلَن : ۹بار

۷۔فاعلاتن مفاعِلن فعلن : ۵بار

۸۔فعلُن/فَعِلُن چار بار : ۲بار

۹۔مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن : ۱بار

۱۰۔مفعول فاعِلات مفاعیل فاعِلن : ۳بار

کل : ۳۳

بحیثیت مجموعی یہ کتاب فیضیات کے مطالعے میں نہایت اہم ہے۔علاوہ ازیں علم عروض کے اعتبار سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔

غ۔م۔طاؤس: فن اور شخصیت

یہ شفقؔ سوپوری کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں انہوں نے کشمیر سے تعلق رکھنے والے متوسط دور کے ایک اہم سخنور غلام محمد میر طاؤس کی حیات اور ان کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ موضوع کی اہمیت کے بارے میں شفقؔ سوپوری یوں لکھتے ہیں:

> ''وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے اُردو کے معماروں کی فہرست میں غلام محمد میر طاؤسؔ کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کا تعلق ایک نہایت ہی باثروت ادبی دور سے رہا ہے۔ ان کے عہد کے اُردو شاعروں اور ادیبوں کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف کشمیر میں اُردو ادب کی روایت کو فروغ دیا بلکہ اس کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ بھی کیا۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر طاؤسؔ کے عہد میں اُردو زبان و ادب کی روایات کو اس قدر مستحکم نہ کیا جاتا تو آنے والے دور میں یہاں چوٹی کے سخنور، نقاد، محقق اور ادیب پیدا نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے طاؤس کا عہد کشمیر میں اُردو ادب کے سفرنامے میں ایک اہم پڑاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور کے مشاہیر نے اپنی گرانقدر تخلیقات سے اُردو ادب کے اعلیٰ حلقوں میں نہ صرف اپنے لیے جگہ بنائی بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ادب کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا''۔ ۲۶

طاؤس اور ان کے ہم عصر شعراء نے اگرچہ زیادہ ادبی سرمایہ پیچھے نہیں چھوڑا مگر ان کی

نثری اور شعری تخلیقات ادب کے اعلیٰ معیار اور اقدار کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ بے شک ان مشاہیر نے آنے والی نسلوں کو متاثر کیا۔ ان میں سے بعض کے کارنامے وقت کی گرد میں گم ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ایسے مشاہیر کے ادبی کارناموں کو صحیح تناظر میں منظر عام پر لانے کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے شفیق سوپوری نے یہ مقالہ رقم کیا ہے۔

مقالے کے پہلے باب میں طاؤس کے حالاتِ زندگی کا پورا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہی حیات کے اہم واقعات طاؤس نے خود بیان کئے ہیں۔ اسی باب میں طاؤس کے عہد اور ان کی شاعرانہ شخصیت کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان کی دو تخلیقات ''موج موج'' اور ''یادوں کے آنسو'' کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم میں شفیق سوپوری نے پورے استدلال اور معروضی نقطہ نظر سے طاؤس کی شاعرانہ اہمیت پر بحث کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ طاؤس نے اپنے عہد کی نظم کے عام رجحان سے متاثر ہو کر غزل کے ساتھ نظم بھی کہی۔

اس کے بعد طاؤس کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے شفیق سوپوری یوں کہتے ہیں کہ طاؤس کا دور گذشتہ عہد کی سیاسی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ اس دور کا آغاز کم وبیش اس صدی (انیسویں صدی) کے وسط سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے گزشتہ عہد کی سیاسی تحریکوں کے مقابلے میں اس دور کی اجتماعی زندگی میں عام طور پر سماجی، معاشی اور ثقافتی بازتعمیر اور ایک نئے سماج وادی نظام کا فروغ دینے کی مساعی میں نمایاں ہونے لگیں۔ ان مساعی کا نقطۂ آغاز ملک کی آزادی ہے۔ اس کے بعد طاؤس کی بعض نظموں کا تجزیہ کر کے شفیق سوپوری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ طاؤس نے ابتداء میں مشہور کلاسیکی شعراء میرؔ، غالب وغیرہ

سے بھی اثر لیا بعد میں جوش ملسیانی، جوش، حفیظ جالندھری، جگر، اقبال، فیض، فانی وغیرہ سے بھی بھرپور اثر لیا۔ مقامی سطح پر طاؤس نے مہجور، دلسوز اور غلام رسول نازکی سے اثرات قبول کئے۔

طاؤس کے چند نمایاں معاصرین کا تذکرہ کرتے ہوئے شفقؔ سوپوری نے غلام رسول نازکی، شہہ زور کاشمیری، پنڈت نند لال کول طالبؔ، تنہا انصاری اور رساؔ جاودانی کے سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ انفرادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور طاؤس کی شاعرانہ حیثیت متعین کی ہے۔ اس ضمن میں شفقؔ نے طاؤس کی چند اہم نظموں کے تنقیدی مطالعے سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلیں، ناپختگی اور تجربے کے تخلیقی اظہار پر گرفت کمزور ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ شفقؔ سوپوری نے طاؤس کے فکری عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کلام میں تصورِ غم کی مرکزیت، تخیل کی بلندی، جذبات کی رفعت اور خلوص کی آسودگی کی نشاندہی کی ہے۔ اقبال سے اثر لینے کی وجہ کے باب میں شفقؔ سوپوری یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اصل میں طاؤس کے حساس دل اور ذہن کو اپنے عہد کے حالات کی آگہی ہو چکی تھی ان کے سامنے نوعِ انسانی کی دیرینہ قبا تار تار تھی۔ تہذیب کے پروردگار بے مروت ہو چکے تھے۔ عصرِ حاضر کی فتنہ سازیاں عروج پر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اقبال کا سہارا لینا پڑا۔ اور یہ کہ طاؤس نے اپنے دور کے خارجی حالات و واقعات سے اپنے ذہن اور نفسیات کی تعمیر و تہذیب کر کے اپنے تخلیقی لاشعور کو تشکیل دیا۔ چنانچہ ان کا اپنے خارجی حاجات و واقعات پر شخصی ردِعمل بالکل منفرد ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جس کا حقدار طاؤس کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

آخر پر شفقؔ سوپوری طاؤس کی شاعرانہ حیثیت متعین کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

''طاؤس کے دور کے اہم رجحانات میں سے جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے اقبالیت، وطن پرستی، سیاسی بیداری، انقلاب پرستی اور اشتراکیت قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک طاؤس کا تعلق ہے ان کے کلام میں ان رجحانات کو شدت کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے دور کے رجحانات کا اظہار کرتے ہوئے فکر ونظر کی بیداری کا ثبوت دیا بلکہ اسلوب واظہار کی مروجہ خصوصیات کو بھی فنی آگاہی کے ساتھ برتنے کی کوشش بھی کی ہے۔ طاؤس کے یہاں روایت کا بھی برتاؤ ملتا ہے''۔ ۲۷

باب سوم میں شفق سوپوری نے کشمیر میں اُردو نثر کی اہمیت اور طاؤس کے نثری کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ کشمیر میں اُردو نثر کی ابتداء اور اس کے ارتقائی تاریخ بیان کرتے ہوئے سوپوری نے کشمیر کے افسانوی ادب، تنقید نگاری اور انشائیہ نگاری کی انفرادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اس کے بعد طاؤس کی نثر نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے انشائیوں اور مضامین میں فکری اور فنی امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔ باب چہارم میں مصنف نے طاؤس کی ادبی اہمیت کا تعین کیا ہے۔

مخزنِ موسیقی

شفق سوپوری نے اپنی تصانیف ''موسیقی، شاعری اور لسانیات'' اور ''اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی'' میں جو جائزے لئے ہیں ان کی بنیاد اس علم پر استوار ہے جو انہیں موسیقی کے عرفان سے حاصل ہوا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ علمِ موسیقی پر خامہ فرسائی کرنے کے لیے

موسیقی کا کماحقہٗ عملی ادراک وعرفان ہونا ضروری ہے۔اس کتاب میں شفؔق سوپوری نے موسیقی کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ایسا تب ہی ممکن ہوا ہے جب انہوں نے تقریباً سات برس تک ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کا عرفان درساً حاصل کیا ہے۔اس عمل سے انہیں موسیقی کے فنی رموز سے واقف ہونے کا موقعہ فراہم ہوا۔

اس کتاب میں شفؔق سوپوری نے نہایت ژرف نگاہی اور پورے استدلال کے ساتھ موسیقی کی معنویت،صدائے موسیقی،موسیقی کے عناصر ترکیبی کے علاوہ ہندوستانی موسیقی کے نظام کے ساتھ ساتھ مغربی،عربی اور ایرانی موسیقی کے نظاموں پر روشنی ڈالی ہے۔

مخزنِ موسیقی کا اہم بات ''ہندوستانی موسیقی ہے''۔شفؔق سوپوری نے ہندوستانی موسیقی کی معنویت بیان کرتے ہوئے گرنتھ سنگیت،لکش سنگیت، بھاوی سنگیت کی وضاحت کر کے اپنے نظریئے کو باوثوق بنایا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے مختلف روایات اور نظریات کے تناظر میں سنگیت کی سرگم کے سروں کی پیدائش کی وضاحت کی ہے اور تینوں سپتکوں کے اکیس سروں کی خصوصیات بیان کی ہے۔شفؔق سوپوری نے شرتیوں کی تقسیم اور سروں کی کیفیات کی ایک جدول سے ہندوستانی موسیقی کی سرگم کے بنیادی عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ ایک اور جدول میں سروں کے طول،اعداد تموج فی سیکنڈ اور کھرج سے ان کے تناسب کی وضاحت کر کے دو صدائے موسیقی کے عموجات میں باہمی تناسب کی نشاندہی کی ہے۔

ہندوستانی موسیقی میں ٹھاٹھوں کے نظام کی وضاحت کرتے ہوئے شفؔق سوپوری یوں رقمطراز ہیں:

> ''ہندوستانی موسیقی میں سارے گاما پادھانی ساشدھ سُر ہیں۔
> انہیں شدھ ٹھاٹھ کہا جاتا ہے۔یہ شدھ ٹھاٹھ بلاول کا ٹھاٹھ ہے

کیونکہ صرف اسی میں شدھ سروں کا استعمال ہوتا ہے۔ ٹھاٹھ کے بارے میں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سات سروں سے تیار ہوتا ہے اور کسی سُر کے دونوں روپ (شدھ اور کومل) کسی بھی ٹھاٹھ میں استعمال نہیں ہوتے۔ ٹھاٹھ صرف آروہی میں ہوتا ہے اور اس میں سموادی یا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ٹھاٹھ کو پہچاننے اور اُن کے سرروپ وغیرہ یاد رکھنے کے لیے اس کا نام اس ٹھاٹھ سے پیدا کسی مشہور راگ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس لیے ٹھاٹھ نام والے راگوں کو آشے شدھ یا جنک راگ کہا جاتا ہے اور وہی اور وہی اور امروہی (مورچھنا) تین صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ سمپورن، شاڑواوڑو''۔ ۲۸

شفق سوپوری نے اس کے بعد ہندوستانی موسیقی کے دس ٹھاٹھوں کی تفصیل بیان کی ہے اور ان میں لگنے والے سروں کے امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد پنڈت وکنٹھ مکھی کے بہتر ٹھاٹھوں کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ایک ٹھاٹھ سے چار سو اسی بننے کی ترکیب بھی بیان کی ہے۔ اور اس ترکیب سے بننے والے کل ٹھاٹھوں کی تعداد چونتیس ہزار آٹھ سو اڑتالیس کی پوری تفصیل بھی بتائی ہے۔ مگر بقول شفق سوپوری فی مانہ دو سو سے زیادہ راگ مروج نہیں ہے۔ شفق سوپوری نے دس ٹھاٹھوں کی تفصیل میں ہر ٹھاٹھ سے متعلقہ راگ راگنیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور پھر راگوں کے اقسام بیان کئے ہیں۔

اس کتاب کا ایک اور اہم باب ''ہندوستانی موسیقی میں راگوں کا حُلیہ'' ہے۔ بقول شفق سوپوری ان راگ اور راگنیوں کے حلیوں سے ہندوستانی موسیقی کی جمالیات میں مذہب اور

اس کا ملاپ ایک اہم نظریئے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔فرماتے ہیں:

''موسیقی کے دیوتا مہادیو کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے پانچ سَر ہیں۔مہادیو کے چار سَروں میں ایک سَرزمین (Globe) کے چار اطراف کی طرف ہے، یعنی ہر سَر کی ایک سمت ہے، مشرق، مغرب، جنوب، شمال، جب کہ پانچواں سَر آسمان کی سمت اٹھا ہے۔ پانچ سروں میں ہر ایک سَر سے ایک راگ پیدا ہوتا ہے، اس طرح سے پانچ راگوں کی تخلیق ہوتی ہے، یہ پانچ راگ مندرجہ ذیل ہیں: بھیرون، ہنڈول، دیپک، شری، میگھ چھٹا راگ 'مالکوس' مہادیو کی زوجہ پاروتی سے مخرج ہے''۔۲۹

اس کے بعد شفق سوپوری نے مختلف راگوں جیسے راگ شری، راگ میگھ، راگ دیپک، راگ بھیرون، راگ ہنڈول کی وضع بیان کی ہے۔مثال کے طور پر راگ دیپک کی وضع کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''یہ راگ اپنی وضع میں ایک خوبصورت مرد سے مشابہ ہے جو عنفوانِ شباب میں ہے۔ پُروقار طور پر سرخ ملبوس میں، اندھیرے میں چمکتا ہوا، اس کی شخصیت کی چمک اتنی تیز ہے کہ اس کی کرنیں تیرگی میں آگ کے شعلوں کی طرح اترتی ہیں۔ دیپک راگ کی پانچ راگنیاں ہیں: کامود، دیسی، کانڈا، کیدار اور نٹ''۔۳۰

ہندوستانی موسیقی کی مختلف ہیتوں جیسے دھرپد، خیال، دھمار، ترانہ، ٹپہ، ٹھمری کی تعریف

تاریخی تناظر میں کی گئی ہے۔اس کے بعد ہندوستانی موسیقی کے مختلف گھرانوں کی وضاحت کی گئی ہے۔تال کے نظام کی پوری وضاحت کر کے کئی اہم تالوں کا نقشہ دیا گیا ہے۔اس کے بعد ہندوستانی موسیقی کے مختلف سازوں کی تعریف کی گئی ہے۔ہندوستانی موسیقی کی ابتداء اور ارتقاء پر تاریخی پس منظر میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم میں شفقؔ سوپوری نے مغربی،عربی اور ایرانی موسیقی کے نظاموں کی وضاحت کر کے اس کتاب کو اختصاص و انفراد بخشا ہے۔مجموعی طور پر یہ کتاب ہندوستانی،مغربی،عربی اور ایرانی موسیقی کے نظام ہائے کو سمجھنے میں بہت کارآمد ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شفقؔ سوپوری نے نہ صرف موسیقی کا عملی دس لے کر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے بلکہ گہری مطالعے کے بعد اپنے خیالات کو وسعت اور توثیق بخشی ہے۔

جہات

آٹھ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ شفقؔ سوپوری کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں جو مضامین شامل ہے ان کی تفصیل یہ ہے:(۱) بیتاب کی نظموں میں پیکر تراشی،(۲) رفیق راز کی متصوفانہ فکر (۳) ہمدم کاشمیری کا شہر غزل (۴) بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی رجحانات (۵) جموں و کشمیر کے اُردو شاعروں کی نظموں میں یک جہتی کا پیام (۶) بیتاب کی نظموں میں علامت نگاری (۷) شیرازہ اُردو کا پچاس سالہ سفر (۸) کلامِ غالب میں تفہیمِ غالب۔

ظاہر ہے کہ ان مضامین میں دو کو چھوڑ کر سب کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں جموں و کشمیر کے اُردو ادب کے منظر نامے سے ہے اور اکثر مضامین یہاں کے نمایاں شعراء کے فن پر لکھے گئے ہیں۔حرفِ آغاز میں شفقؔ سوپوری نے ریاستِ جموں و کشمیر میں اُردو زبان و ادب کی

موجودہ صورت حال پر کئی اندیشے ظاہر کئے ہیں مثلاً یہ کہ ریاست میں اُردو زبان سرکاری زبان ہونے کے باوجود اپنی بقا کے لیے کوشاں ہے اور سرکاری سطح پر اس کے فروغ کے لیے لیے کئے جانے والے اقدامات تسلی بخش نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی سطح پر بھی صورتحال اطمینان بخش نہیں۔ بقول شفقؔ سوپوری ریاست کی یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں ان کی حیثیت مشکوک ہے۔ یہ اور کئی وجوہات کی بنا پر کئی اہم موضوعات پر لکھے گئے مقالے زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکتے۔ ریاست کے شعری منظرنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے شفق سوپوری تنقید نگاروں کی سرد مہری کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے متعدد شعراء کے مجموعوں پر دیباچے تحریر کئے ہیں تاہم ان کی نوعیت تعارفی اور تاثراتی ہے۔ ان میں تعینِ قدر سے زیادہ حوصلہ افزائی کا خیال رکھا گیا ہے۔ لہٰذا صورتحال کا تقاضا یہ ہے کہ نئی نسل اپنا نقاد خود پیدا کرلے۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے تحت شفقؔ سوپوری نے یہ مضامین قلمبند کئے ہیں۔

بیتاب کی نظموں میں پیکر تراشی ایسا مقالہ ہے جس میں پہلے ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے اُردو زبان کے ایک ممتاز شاعر پرتپال سنگھ بیتاب کے شعری سفر کا اجمالی جائزہ کھینچا گیا ہے۔ پھر پیکر تراشی کے فن میں بیتاب کے امتیازی رویہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے بیتاب کی نظموں میں پیکرِ تراشی کی کارفرمائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> ''بیتاب نے نظم کو اپنے تجربات کے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بناتے ہوئے ایک ایسے لسانی رویے سے سروکار رکھا ہے، جسے موضوع اسلوب اور قاری کی ایک مثلث قرار دیا جاسکتا ہے۔

وہ اپنی نظموں میں پیکر تراشتے وقت اس بات کا خاص خیال
رکھتے ہیں کہ پیکر قاری کی روح میں خفتہ جذبات اور احساسات
کو جگا کر ابلاغ کی موثر سبیل کا ذریعہ بن جائے۔ بیتابؔ کے
تراشے ہوئے پیکر تازئید لفظی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ
کہیں کہیں محض ایک لفظ، تشبیہ اور استعارے سے ایک ایسی
صورت متشکل ہوتی ہے جو قاری کو متن کے اندر چھپے ہوئے
معنوی امکانات کی سیر کراتا ہے۔ یہ پیکر گنجلک نہیں کہ قاری
بھٹک کر رہ جائے بلکہ قاری کو لفظوں کے اندر پنہاں دور افتادہ
آہنگ کا احساس بھی دلاتے ہیں''۔۳۱

متذکرہ بالا اقتباس سے یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ شفقؔ سوپوری پیکرِ تراشی کے فنی لوازمات سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں۔ بیتاب کی نظموں کے تجزیے سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان کے یہاں پیکر طرازی کے عمل میں اجمال اور اختصار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ عمل ان جگہوں پر بھی کارفرما ہے جہاں بیتاب محض پیکرِ تراشنے کی جستجو کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''بیتاب کی نظموں میں پیکروں کی تازہ کاری فروغ پاکر
پرجوش تجربات کی روشنی میں راہِ ابلاغ تلاش کر کے نہ صرف
حقائق کا انکشاف کرتی ہے بلکہ انہیں قبول کرنے کی ترغیب بھی
دیتی ہے۔ ان پیکروں سے جو جمالیاتی کیف پیدا ہوتا ہے اس
کی تہہ میں چھپے ہوئے لفظی آہنگ اور استعاروں یا تشبیہات

کے حسی انسلاکات ہمیں ان سے ایک قسم کی نسبت شناخت
کرنے کے گہرے انبساط اور کیف سے ہمکنار کرتے
ہیں''۔ ۳۲

شفیق سوپوری معروضی بنیادوں پر بیتاب کی نظموں کا تجزیہ کر کے مثالوں کے ذریعہ اپنا نقطۂ نظر یوں پیش کرتے ہیں کہ بیتاب کا فن یہ ہے کہ وہ بصری پیکر کو بنیاد بنا کر لفظوں، استعاروں اور ان کے تلازمات سے اسے کئی پیکروں میں ڈھالتے ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا عرفان ہے کہ شاعرانہ سچائی اور مظاہر کے درمیان ایک غیر مرئی وحدت ہوتی ہے، لہٰذا وہ پیکروں کے ذریعہ سے اس وحدت کی حقائق کے دریافت کے عمل سے گذرتے ہیں۔ یوں بیتاب کے یہاں استعارہ سازی کی خلاقانہ صلاحیت ان کے اسلوب سے ایک نیا رشتہ استوار کرتی ہے جہاں پیکر ڈکشن کی تازگی اور مواد سے زرخیز ہو کر جذبات کو انگیز کرتے ہیں اور ایسے حالات و واقعات کا احساس دلاتے ہیں جو ہماری حدِ مشاہدہ سے باہر ہوتے ہیں۔ بیتاب کے پیکر خالص علامتی نہیں بلکہ یہ مشن میں پوشیدہ جذباتی ارتعاشات سے گہرے طور پر متاثر ہیں۔ یہی جذباتی ارتعاشات قاری کو اپنے ذاتی تجربات کے پیش نظر پیکروں سے اثر قبول کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

رفیق رازؔ کی متصوفانہ فکر

سرزمینِ کشمیر اپنی باثروت صوفی روایات کی وجہ سے تمام عالم میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ کشمیر میں قدیم زمانے سے ہی صوفیانہ عناصر نے یہاں کی ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کو ہر سطح پر متاثر کیا ہے۔ ان صالح عناصر نے یہاں تخلیق ہونے والے ادب پر بھی اثرات مرتب کئے ہیں چنانچہ اُردو ادب کے حوالے سے یہ بات وثوق سے کہی

جاسکتی ہے کہ زبانِ اُردو میں تخلیقی سرگرمیوں کے آغاز سے بالخصوص شعری تخلیقات میں کسی نہ کسی سطح پر متصوفانہ فکر کارفرما رہی ہے۔

رفیق رازؔ ریاستِ جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک نمایاں شاعر ہیں اور اُردو کے اعلیٰ ادبی حلقوں میں انہیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ان کے کلام میں اگرچہ کئی رجحانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے تاہم شفقؔ سوپوری نے ان کی شاعری میں متصوفانہ فکر کو ایک اہم اور نمایاں رجحان قرار دیا ہے۔رفیق راز کی شاعری میں اس رجحان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شفقؔ سوپوری یوں رقمطراز ہیں:

> ''رفیق راز صوفی نہیں ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی متصوفانہ فکر ان کے اشعار کی جان ہے اور یہ اشعار شعریت سے معمور بھی ہیں اور معاصر فکر کے ترجمان بھی۔رفیق راز کی شاعری کے فنی اور فکری پہلو جس قدر گہرے ہیں اتنے ہی متنوع بھی ہیں۔ان کی فکر کے وقار نے ان کی شاعری کو ایک انوکھا آہنگ عطا کیا ہے جس میں متصوفانہ لَے کی حرکت اور اس حرکت سے پیدا ہونے والی حرارت کی طرح جوہر کی طرح موجود ہے۔لہٰذا ان کی شاعری ایک ایسے منور نقطے کا درجہ رکھتی ہے جسے ان کی شاعرانہ شخصیت اور روحانی فکر کا سنگم کہا جاسکتا ہے۔رفیق راز کا مشاہدہ اور تجربہ کسی نہ کسی طرح ایک پُروقار لے کے ساتھ متصوفانہ فکر پر منتج ہوتا ہے۔لہٰذا ان کی شاعری کا ایک امتیازی پہلو یہی رجحان ہے''۔ ۳۳

جدید شاعری میں تصوف کے رجحان کے اسباب کو پرانے مسمات اور اقدار سے دست بردار ہونے کے احساس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے یقینی، تشکیک، تنہائی اور مایوسی قرار دے کر شفق سوپوری فرماتے ہیں کہ رفیق رازؔ کے یہاں صورتحال اس کے برعکس ہے کیونکہ ان کی شاعری میں تصوف کا تصور اپنی پاکیزہ روایت کے ساتھ علمی اور اجتہادی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں روحانی بصیرت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''رفیق راز کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کی ایک مقدس اور پاکیزہ روحانی روایت کے سائے میں پروان چڑھے ہیں جہاں بزرگوں، فقیروں، قلندروں اور خدادوست لوگوں کی حیات کے نورانی قصے اہلِ بصیرت کے کردار اور نفسیات پر کسی نہ کسی طور اثر انداز ہوتے ہیں۔ اہل معرفت کے دلوں تک اس عظیم الشان روایت کے سوتے لل دید، شیخ العالمؒ، صمد میر، احد زرگر، شمس فقیر، رحیم صاحب سوپوری، وغیرہ شعراء کے کلام کے لافی سرچشموں سے پہنچتے ہیں۔ راز نے اس روایت سے اس قدر فیضان حاصل کیا ہے کہ ان کی شاعری کو اس روایت کی تجدید اور توسیع کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہی آہنگ، شیرینی، نرمی، حلاوت، جلال و جمال، آگہی اور شعور کے عناصر پائے جاتے ہیں جو اس روایت کا خاصہ ہے''۔ ۳۴

شفقؔ سوپوری نے اپنی تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لا کر رازؔ کے اشعار کا تجزیہ گہرائی سے کر کے ایسے الفاظ، استعارات اور علائم کی نشاندہی کی ہے جو ان کے بنیادی رجحان اور رموزی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''رفیق رازؔ صداقتوں اور حقیقتوں کا صحت مند شعور رکھتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ حقائق اور صداقتوں کو منظم و مربوط کرنے اور ان میں جمالیاتی آہنگ پیدا کرنے کے لیے خیال آفرینی کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے یہاں تشبیہ و استعارہ اور علامت کے استعمال سے مختلف حقیقتیں آپس میں پیوست ہوتی ہیں۔ رفیق رازؔ نے جدید اور مابعد جدید غزل کو متصوفانہ فکر کے حوالے سے ایک نئی شعری جمالیات عطا کی ہے۔ یہ ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے''۔ ۳۵

ہمدم کاشمیری کا شہرِ غزل

ہمدم کاشمیری خالصتاً غزل کے شاعر ہیں۔ وہ اپنی فکر اور لب و لہجے کی وجہ سے اُردو کے موجودہ شعری منظرنامے میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ہمدم کاشمیری بنیادی طور پر جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہیں اور ان کے کلام میں جگہ جگہ پر جدید فکر کے عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ بقول شفقؔ سوپوری نئی غزل کو مقبول خاص و عام بنانے میں ان جدید شعراء کا بہت بڑا ہاتھ ہے جن کا ذہنی اور علمی پس منظر اپنے پیش رؤں کے مقابلے میں وسیع تر تھا اور جن کے یہاں روایت کا گہرا شعور بھی تھا۔ ہمدم کاشمیری بھی نئی غزل کے ان معماروں میں سے ہیں جنہوں نے گزشتہ صدی کے انسان اور معاشرے کی بدلتی ہوئی صورتحال کی

بھرپور عکاسی کی۔ اتنا ہی نہیں لسانی سطح پر بھی انہوں نے غزل کو ان تبدیلیوں سے روشناس کرادیا جو روایت کے پیشِ نظر خیرہ کن بھی ہیں۔ ہمدم کی شاعری میں بھی نئی لسانی تشکیل، تازہ موضوعات اور ندرت بیان سے ایک نئے دم نئے داخلی اور بیرونی تجربے کا احساس ہوتا ہے۔

ہمدم کاشمیری کے اشعار کے تجزیے کے بعد شفقؔ سوپوری یوں فرماتے ہیں:

> ''ان الفاظ، استعاروں اور علامتوں کی تلازمی اور ایمائی حیثیت ایک ایسے جدید لب و لہجے کا پتہ دیتے ہیں جو تربیت یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلیقہ مند بھی ہے۔ یہ وہ جدید لسانی عمل نہیں جہاں تہذیب کی سرحدوں کو روند کے آگے بڑھنا فیشن اور معمول بن گیا تھا۔ نہ یہ انسانی نفسیات اور بشری مجبوریوں کو ذہنی عیاشی کے لیے سفاکیت کے ساتھ عریاں کرنے کا وہ ناشائستہ اسلوبِ بیان ہے جسے بعض شعراء نے اپنے وقار اور امتیاز کی اساس بنایا تھا۔ ہمدم کاشمیری کی غزل جدید لسانی جمالیاتی کو مہذب اور پُروقار بنانے کا ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے''۔۳۶

نئی غزل کے اہم موضوعات کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمدم کاشمیری کا غم، درد اور نوحہ ایک خاص دور یا ایک خاص طبقے یا تہذیب سے متعلق نہیں بلکہ یہ انسانی حیات کے ارتقائی دور پر محیط ہے۔ اسی طرح سے انسانی رشتوں کے تعلق سے ہمدم کاشمیری کی شاعری میں ایک انوکھے طرز احساس کی نشاندہی کرتے ہوئے شفقؔ سوپوری فرماتے ہیں کہ ہمدم کو انسانی ذات کی دیوار میں پڑی ہوئی شگاف کے اندر بے یقینی، تنہائی، تشکی، بے بضاعتی

اورخوف کے جنگل اکتے نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں رشتہ نہ عاشق ومعشوق کا نہ مرداورعورت کے باہمی تجربے کا مظہر ہے بلکہ رشتوں کی شکست وریخت کے نتیجے میں جو بے چہرگی ابھرتی ہے وہ اصل میں ذات کی ہی ایک مسخ شدہ صورت ہے۔

ہمدم کاشمیری کے یہاں معاصر صورتحال کی ترجمانی کے حوالے سے ان کے انفرادی اظہاری رویے پر بحث کرتے ہوئے شفیق سوپوری کا یہ کہنا درست ہے کہ کشمیر کے خونین حالات سے ہمدم کا متاثر ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔لیکن ہمدم نے مقامی درد کو آفاقی درد کا استعارہ بنا کر اپنی شاعرانہ ذکاوت، وسیع مطالعہ، ذاتی تجربات ومشاہدات کی گہرائی اور اپنے انفرادی رنگ کا پورا ثبوت دیا ہے۔اس حوالے سے ہمدم کاشمیری کے کئی اشعار کا تجزیہ کرنے کے بعد شفیق سوپوری یوں فرماتے ہیں:

> ''مندرجہ بالا اشعار میں بیان کی گئیں حقیقتوں کو جموں وکشمیر کے حالات کے پس منظر میں دیکھیں، ملک کے خونین فسادات کے آئینے میں دیکھیں، یا پھر بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات اور غلبہ پسندی کے تناظر میں دیکھیں، آپ کو بہر حال انسانی درد، کرب اور ابتلا نظر آئیں گے۔یہی بات ہمدم کاشمیری کو امتیازی شان عطا کرتی ہے''۔۳۷

بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی کے رجحانات

یہ مضمون دراصل اُردو ادب کے ایک مقتدر نقاد پروفیسر ظہور الدین کے ایک اہم مقالے کا تنقیدی جائزہ ہے۔اس مقالے پر پروفیسر موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ اس تصنیف میں پروفیسر ظہور الدین نے بیسویں صدی کے اردو ادب کا مطالعہ صرف بیسویں

صدی کے اُردو ادب تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ یہ مطالعہ اس عظیم الشان ادبی روایت پر محیط ہے جس کے سوتے عربی، فارسی اور سنسکرت ادبیات سے پھوٹتے ہیں۔

شفقؔ سوپوری نے مذکورہ کتاب کا مطالعہ گہرائی سے کر کے پروفیسر ظہور الدین کی علمی استعداد، تنقیدی بصیرت اور تحقیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اپنے جائزے کے آخر میں شفقؔ سوپوری یوں فرماتے ہیں:

> ''اس پوری کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ظہور الدین نہ صرف تحقیق کرتے وقت اتھاہ گہرائیوں میں جا کر حقائق کے گہر سطح پر لاتے ہیں بلکہ اپنے معروضی نقطۂ نگاہ سے ان کو تولتے ہیں، پرکھتے ہیں اور ان کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ صرف حقائق اور معلومات کا انبار نہیں لگائے بلکہ انہیں نقد و احتساب کے عمل سے بھی گزارتے ہیں''۔ ۳۸

اسی طور پر شفقؔ سوپوری نے ادب کی غایت، کلاسیکیت، رومانیت، ادب برائے اخلاق، ادب برائے ادب، ادب برائے جمالیات، مارکسیت، ترقی ہند ادب، ترقی پسند تحریک، تحلیل نفسی، شعور کی رو، تاثریت، اشاریت، وجودیت، مارکسیت، ڈاڈزم اور سررئیلزم جیسے موضوعات پر نہ صرف بحث کی ہے بلکہ تنقیدی نقطہ نظر سے بھی ان پر روشنی ڈالی ہے۔

جموں و کشمیر کے اُردو شاعروں کی نظموں میں یکجہتی کا پیام

اس مقالے میں شفقؔ سوپوری نے سب سے پہلے نوعِ انسانی کی تاریخ کے پسِ منظر ان رزم آرائیوں، خانہ جنگیوں، مذہبی اور فرقوں کی چپقلشوں کا ذکر کیا ہے جن سے دنیا خونِ انسانی

کی ندیوں کا سنگم بن گئی۔ اور ان محرکات کی نشاندہی تاریخی شواہد سے کی ہے جن سے قومی یکجہتی کا رجس ان پیدا ہو۔ فرماتے ہیں:

''قومی یکجہتی کا جذبہ انسانی تاریخ کے اس مرحلہ پر نمودار ہوا جب ایک ہی خطے میں مختلف نسلوں اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی قوم کی صورت میں آباد ہو گئے۔ انہی نسلوں اور عقیدوں کے درمیان اختلافات نے بعض اوقات خونریز معرکوں کی شکل اختیار کی جس کے نتیجے میں بہت سی اقوام کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ لہٰذا مخلوط اقوام کے لیے یہ ضروری پایا کہ وہ مختلف نسلوں اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والوں میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کریں جسے نظامِ ملک میں بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہو۔ چنانچہ باشعور قوموں نے نسلی اور عقیدتی فضیلت سے تعرض کر کے مادرِ وطن کو افضل قرار دیا''۔۳۹

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف نسلوں، عقیدوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد ایک مخلوط سماج میں صدیوں سے ایک سچی سیکولر معاشرے کی مثال پیش کر رہے ہیں۔ بقول شفیق سوپوری اس ملک کی تاریخ نے قومی یکجہتی، رواداری، یگانگت اور یک رنگی کے بجائے جلوۂ صد رنگ کے جو مظاہر پیش کئے۔ ان کی نظیر نہیں اور اسے بہم پہنچانا مشکل ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب جب مذہبی و علاقائی عصبیت، تنگ نظری، جہالت اور معاشی پسماندگی کے نتیجے میں ملک کی سالمیت کو خطرات لاحق ہو گئے، ملک کی قیادت کے

ساتھ ساتھ ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانشوروں نے اپنی قومی ذمہ داری کو سمجھ کر قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں۔ بقول شفیق یہ سلسلہ امیر خسرو سے شروع ہوا ہے۔ خسرو کے بعد خواجہ بندہ نواز، حضرت امین الدین علی علیٰ، حضرت میراں جی، حضرت قاضی محمد سحری سحری اور دیگر کئی حضرات نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔

اردو زبان کے سیکولر کردار پر روشنی ڈالتے شفیق سوپوری فرماتے ہیں کہ اپنے سیکولر کردار کی وجہ سے اُردو زبان ہر دور میں عوامی خواہشات اور امیدوں پر کھرا اتری ہے۔ اس زبان نے نہ صرف عوامی رابطے کے طور پر اپنی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں بلکہ ملک کے عوام میں اتحاد اور اخوت کا جذبہ پیدا کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔

تقسیم ملک کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتحال کا اثر جموں وکشمیر کے شعراء کی فکر پر بھی پڑا۔ ایسی صورت میں جب انسانیت سسک رہی تھی جموں وکشمیر کے شعراء نے ہندوستان کے دوسرے خطوں سے تعلق رکھنے والے شعراء کی طرف اخوت، رواداری اور قومی یکجہتی کا پیغام موثر طور پر دیا۔ شفیق سوپوری اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ایسے حالات میں جموں وکشمیر کے شاعر اور ادیب اپنی قومی اور انسانی ذمہ داریوں کو کیسے دامن بچائے۔ چنانچہ ملک کے دوسرے خطوں کی طرح یہاں بھی شاعروں نے قومی یکجہتی، سیکولرزم، اخوت، حب الوطنی اور انسانی اقدار کی پاسداری کے لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ جموں وکشمیر کے جن شعراء نے اپنی نظموں میں قومی یکجہتی کا پرچار کیا ان میں خاص کر نشاط کشتواڑی، عابد مناوری، تنہا انصاری، فاضل

کاشمیری، غ۔م۔طاؤس، شوریدہ کاشمیری، عرش صہبائی، حکیم دوارکا ناتھ حاذق، میکش کاشمیری، اندرجیت شرما، شہہ زور کاشمیری، مسعود حسین مسعود، ہربھگوان شاؔد، مہیندر ریہ، گردھاری لال برق، گردھاری لال آنند کے علاوہ دیگر کئی شعراء قابلِ ذکر ہیں''۔۴۰

شفؔق سوپوری موضوع کے حوالے سے ان شعراء کی نظموں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور حوالوں کی روشنی میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

بیتاؔب کی نظموں میں علامت نگاری

اس مقالے میں شفؔق سوپوری نے علامت نگاری کے آغاز اور اس کے لوازمات کی تفصیل بیان کر کے اپنے ایک اہم معاصر پرتپال سنگھ بیتاب کی نظموں میں علامت نگاری کی کارفرمائی کو واضح کیا ہے۔ انیسویں صدی میں فرانس میں ملارے کی امانت میں علامت نگاری ایک تحریک کے طور پر ابھر آئی۔ شفؔق سوپوری پوری وضاحت کے ساتھ علامت نگاری کے اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''علامت نگاری کی بنیاد اس قدیم اصول پر استوار تھی کہ شاعری معنی خیزی کے ذریعے سے اپنے اثرات کو جامع اور وسیع بناتی ہے۔ علامت نگاری کا تصوّر یہ ہے کہ بالواسطہ بیان بعض اوقات شاعری کو تزائیدِ لفظی کا شکار بناتا ہے بلکہ اس عمل سے شاعر کے ذہن میں موجود محشرِ خیال کے اظہار میں بھی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا شاعر پر لازم ہے کہ وہ الفاظ

کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھے کہ یہ الفاظ قاری کے
ذہن کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کریں۔ علاوہ بریں
حسبِ ضرورت ان الفاظ کے معنی میں وسیع امکانات اور
انسلاکات بھی موجود ہوں۔ یہ عمل الفاظ کے مرکبات،
محاوروں حتیٰ کہ جملوں پر بھی محیط ہوتا ہے''۔۴۱

شفیق سوپوری نے اُردو شاعری میں علامت نگاری کے تصور پر بحث کرنے کے بعد اُردو کے اہم شاعروں جیسے اقبال، فیض، احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے زیر اثر نئی علامتوں کو وضع کرنے والوں نمایاں شاعروں کی علامت نگاری پر روشنی ڈال کر پرتپال سنگھ بیتاب کو ایک ممتاز علامت ساز قرار دیا ہے۔ شفیق سوپوری نے بیتاب کی نظموں میں علامت نگاری کی نشاندہی کے لیے ان کی نظموں کے تجزیے سے پہلے اپنے مطالعے کی بنیاد پر یہ انکشاف کیا ہے کہ بیتاب کو علامتی خیال گہرے طور پر متاثر کرتے ہیں اور یہ کہ معاصرین کے مقابلے میں ان کی علامتیں کسی متعین، اساسی یا بنیادی حوالے کی طرف اشارہ نہیں کرتیں۔

اور ایک اہم نکتہ جس کی طرف شفیق سوپوری نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ بیتاب اس رمز سے واقف ہیں کہ نیچر کی عظیم یادوں میں ساری دنیائی اساطیر محفوظ ہے۔ لہٰذا وہ بار بار نیچر کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اگرچہ بیتاب کی علامتیں پیش یا افتادہ ہیں مگر ان کا گہرا مشاہدہ اور وسیع تجربہ انہیں معنی خیزی کے وصف سے مملو ہیں۔ حقیقتوں کو پرکھنے کے لیے اور ان کی جڑ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ کبھی رمزی اور کبھی خود اختیاری رمزی علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔

بیتاب کی چند اہم کے تنقیدی مطالعہ کے بعد ان کی کئی اہم علامتوں کے بارے میں شفیق کا ماننا ہے کہ یہ علامتیں ایسی ہیں جو صرف اپنے روایتی مقاہیم سے ہی سمجھ میں نہیں آسکتی ہیں بلکہ اس کے لیے بیتاب کے فکری رویے سے واقف ہونا ضروری ہے اور یہ کہ بیتاب ہر علامت میں اپنے لاشعور کو Explore کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ہماری تاریخ اور اسطور میں پنہاں ہے۔فرماتے ہیں:

> ''وہ اپنی تاریخ اور اپنے دور کی شکست وریخت پر بالواسطہ تبصرہ نہیں کرتے اور نہ کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں بلکہ بزرگوں کی طرف سے ملے ہوئے اثاثے کے ختم ہونے پر اپنے آنے والے کل کی ایک کربناک تصویر کھینچتے ہیں۔اس تصویر کے لیے وہ ہندوستانی دیومالا، اساطیر، تاریخی واقعات، مذہبی عقائد کے علاوہ کئی خودساختہ اساطیری علامتیں بھی تخلیق کرتے ہیں جو اگرچہ ذاتی ہیں مگر ان سے وابستہ رمزی قصے انہیں آفاقی قدر دیتے ہیں''۔۴۲

بیتاب کی نظموں میں عصری حسیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ان نظموں کا کردار موجودہ معاشرے کا فرد ہے، سیاست گزیدہ ہے، موجودہ معیشت اور معاشرت سے پریشان ہے اور کائناتی قوتیں آج بھی اس لیے تعاقب میں اس طرح ہیں جس طرح روز ازل سے ہیں۔ہر دور میں ذلیل وخوار ہونے والے اس فرد کا زمینی اور آسمانی قوتیں ہر سطح پر استحصال کرتی ہیں۔ شفیق سوپوری عصری آگہی کے حوالے سے بیتاب کی نظموں میں نئی لسانی ترکیب پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''بیتاب اکیسویں صدی کے شاعر ہیں، وہ عالمگیر سطح پر ہونے
والی انسانی اقدار کی شکست وریخت سے واقف ہیں۔
انہیں سائنسی ایجادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے روحانی
کرب کا پورا تجربہ ہے اس لیے وہ ایسی علامتیں خلق کرتے
ہیں جو روحانی اور مادی حقائق پر غالب ہیں۔ یہاں مادی
حقائق علامتوں کا ایک اختلال بن جاتے ہیں جہاں سے
بیتاب بلاواسطہ طریقے سے روحانی اصولوں سے نبرد آزما
ہوتے ہیں''۔ ۴۳

آخر پر شفق سوپوری بیتاب کی نظموں سے متعدد مثالیں پیش کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بیتاب کی نظموں میں علامت اپنے متعلقات اور تلازمات کے وسیلے سے ہر ممکن معانی کو متحرک اور فعال بنا دیتی ہے اور اس طور پر معنی کی مختلف سطحوں پر عمل کرتی ہے کہ ہر معنوی عمل سے قاری کسی ذہنی ردِّعمل تک رسائی حاصل کراتا ہے۔

شیرازہ اُردو کا پچاس سالہ سفر

ریاستِ جموں وکشمیر میں کلچرل اکیڈیمی ایک ایسا اہم ادارہ ہے جس نے ذمہ ریاست کی مخلوط ثقافت، تمدن اور تہذیب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ یہاں بولی جانے والی مختلف زبانوں کے ادب کو فروغ دینا بھی ہے۔ اس ادارے سے اُردو زبان میں ''شیرازہ'' نام کا رسالہ اس کے قیام کے وقت سے ہی شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں مختلف النوع موضوعات پر علمی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ شاعری، افسانے اور انشائیے وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ شفق سوپوری نے کلچرل اکیڈیمی میں اپنے قیام کے دوران جو

تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سب سے اہم شیرازہ اُردو کا اشاریہ ہے اور زیرِ نظر مضمون دراصل اسی کتاب کی ایک تلخیص ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں شفؔق سوپوری نے کلچرل اکیڈیمی کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ریاست جموں وکشمیر کے رنگارنگ ادبی، فنی اور تمدنی ورثے کا محفوظ رکھنے کے سلسلے میں اس خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد شیرازہ اُردو کی تاریخی اہمیت بیان کر کے ان تمام مقتدر ادبی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ جنہوں نے اس رسالے کو قلمی تعاون فراہم کیا ہے۔ ان میں بعض اہم مشاہیر ادب میں جگن ناتھ آزاد، تارا چندر شوگی، ظ۔ انصاری، عرش ملسیانی، قمر رئیس، شمیم حنفی، شارب ردولوی، گوپی چند نارنگ، سلیمان اطہر جاوید، اسلوب احمد انصاری، کرشن چندر، علی عباس حسینی، ابوالکلام قاسمی، عنوان چشتی، جوگندر پال، شکیل الرحمٰن، رام لعل، گیان چند جین، وزیر آغا، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زورؔ، آل احمد سرور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شفؔق سوپوری نے اس رسالے کے پہلے شمارے سے لے کر جلد ۵۹ تک کے خصوصی شماروں کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔

کلامِ غالبؔ میں تفہیمِ غالبؔ

اس مقالے میں شفؔق سوپوری نے پہلے شاعری کے تخلیقی عمل پر گفتگو کر کے تفہیم شعر کے لیے وجدانی کیفیات کی اہمیت ظاہر کی ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ کیونکہ شعر کا نظام استعارے، علامت، پیکر اور تشبیہہ وغیرہ کے ایسے طلسماتی عناصر سے نیا ہوتا ہے جن کے اندر گنجینۂ معنی پنہاں ہوتا ہے، اس گنجینۂ معنی کے دروازے تک صرف ذوق اور وجدان ہی رہبری کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ غالبؔ کی عظمت اور غالبؔ شناسی کی ضرورت اہمیت واضح کر کے کلامِ غالبؔ کی شرح کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''وہ (غالبؔ) تب تک ایک قسم کے غیر واضح اور مسلسل کرب
میں مبتلا رہتے ہیں جب تک کہ ان کا خیال اپنی مکمل ہیّت اور
جملہ امکانات کے ساتھ تخلیق نہ ہو جائے۔ یہ خصوصیت ان کی
پوری شاعری کو ایک منضبط تخلیقی عمل کا درجہ دیتی ہے اور اگر ان
کی شاعری میں یہ اعجاز نہ ہوتا تو نہ جانے کتنے گنج ہائے گرانما
یہ ہمارے ذہن سے محروم ہو جاتے''۔ ۴۴

اس کے بعد شفقؔ غالب کے اس مشہور شعر ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

کی تشریح غالب کے مختلف اشعار کی روشنی میں کرتے ہیں۔ کلامِ غالب کی تشریح کا یہ طریقہ کار بالکل نیا ہے اور اگر شارحِ غالبؔ کی نظر کلام غالب پر گہری ہو تو اُسے کسی اور حوالے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

نیلیما

شفق سوپوری کا یہ ناول کچھ دن پہلے ہی شائع ہو کر آیا ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ناول اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا ناول ہے۔ اس مختصر ناول میں شفقؔ سوپوری نے آدی واسی سماج میں عورتوں کے جنسی استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''اُردو میں اب تک دلت افسانے لکھے گئے ہیں۔ سماج کے
پچھڑے اور پسماندہ طبقوں کی زندگی کو کئی ناول نگاروں نے

موضوع بنایا ہے، مثلاً ریاض احمد گدّی نے اپنے ناول ''فائیر ایریا'' میں اور غضنفر نے اپنے ناول ''دِویہ بانی'' میں نچلے طبقوں کے استحصال کی کہانیاں پیش کی ہیں، لیکن آج تک کسی نے آدی واسی سماج اور ثقافت کو اپنے فکشن کا موضوع نہیں بنایا ہے۔ اس اعتبار سے شفق سوپوری کا ناول اردو کا پہلا ناول ہے جس میں آدی واسی عورتوں کے جنسی استحصال کو آدی واسی سماج اور تہذیب کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے''۔ ۴۵

یہ ناول ایک ایسی آدی واسی لڑکی کی حالات زندگی پر مبنی ہے جو آدی واسی معاشرے کے ماحول سے لگ بھگ ناواقف ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لڑکی غریب اور مفلس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور نہایت کم عمری میں ہی مزدوری کرنے کے لیے گھر سے نکلتی ہے آخر پر وہ کشمیر کے ایک آسودہ حال گھر میں گھریلو خدمتگار کی حیثیت سے ڈھائی سال تک کام کرتی ہے جہاں اُس کی عزت نفس کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ کچھ دن اپنے گاؤں کے بنیا ''لالہ لچمن داس'' کے دکان پر اس کے ساتھ ہتک آمیز سلوک سے پہلی اُس پر آدی واسی سماج میں عورتوں کی ناقدری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد حکیم عبدالصمد قریشی کے گھر میں جو باتیں وہ حکیم صاحب کی بیگم کی زبانی اپنے معاشرے کی بابت سُنتی ہے اُن سے اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سورگ سے نکل کر فرک پر آئی ہے۔ کہانی اُس وقت اچانک ایک ایسا موڑ لیتی ہے جہاں ناول کے مرکزی کردار نیلیما کی زندگی کی پوری سمت بدل جاتی ہے اور وہ حالات کے رحم وکرم پر زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کا بہنوئی رات کے وقت اُسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اُس کی مزاحمت سے اُس کی بہن ''بیتا'' جاگ جاتی ہے جو غلط فہمی کا شکار ہو کر

اپنی چھوٹی بہن ''نیلیما'' کو گھر سے نکال دیتی ہے اُس کے بعد شفق سوپوری نے نہایت ہی بلیغ علامتی انداز بیان سے یہ بتایا ہے کہ ''نیلیما'' جس جس کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتی ہے وہ مدد کے عوض ''نیلیما'' سے وہ مانگتا ہے جو ایک عورت کو جان سے بھی پیارا ہوتا ہے۔ ''نیلیما'' کے بچپن کا دوست ''دھنی رام'' اُسے کچھ دن کے لیے اپنے ایک دوست کے یہاں سر چھپانے کی جگہ فراہم کرنے کی حامی برتا ہے مگر اُس کے پاس پیسے نہیں ہوتے ہیں اس لیے ''نیلیما'' لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے۔ آخر کار ''لالہ لچمن داس'' اُسے ہتھ اُدھار اس وعدے پر دیتا ہے کہ جل پور سے آکر وہ لالہ کی خواہش پوری کرے گی۔

دھنی رام ''نیلیما'' کو اپنے جگری دوست راجندر کے یہاں لے جاتا ہے اور وہاں دھوکے سے اُس کی عزت لوٹ لیتا ہے۔ اس واقعے سے نیلیما کی زندگی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ راجندر کے گھر میں نیلیما کے ساتھ ایک اور واردات پیش آتی ہے۔ نیلیما جب غسل خانے میں نہاتی ہے تو راجندر دیوار کے چھید سے آنکھ لگا کر دیکھتا ہے۔ دھنی رام یہ منظر دیکھ کر بوکھلا جاتا ہے اور راجندر کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ نیلیما کو جب حقیقت معلوم ہوتی ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی عزت کا کھیت تو لٹ چکا ہے اور مزید لوٹ سے بچانے کے لیے اُسے ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ دھنی جب اُسے لدھیانہ لے جاتا ہے تو وہ دھنی کے نام کا سندور اپنی مانگ میں ڈالتی ہے۔

اپریل کے مہینے میں وہ لدھیانہ سے اپنے گاؤں نیرج پور لوٹ کر آتے ہیں۔ اپنے سسرال میں غربت اور افلاس کی انتہا دیکھ کر نیلیما کو دھنی رام پر غصہ آجاتا ہے۔ گاؤں کی کچھ عورتیں ندی پر باتیں کرتے ہوئے نیلیما کی کردار کشی کرتی ہیں۔ نیلیما کی جیٹھانی پدم اس کے حسن و جمال اور حسنِ سلوک سے جل بھن جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر چندر کانت کے کان بھر کر

اسے نیلیما کے خلاف بھڑکاتی ہے۔ یہاں کہانی میں دو حتمی کہانیاں درگا ماں اور نرملا دیوی کی شامل ہوتی ہے۔ درگا کا حسن جب ماند پڑ جاتا ہے تو اس کا شوہر کسی اور عورت کو بھگا لے جاتا ہے اور درگا کو پانچ بیٹوں کی پرورش تنہا کرنا پڑتی ہے۔ بھیک مانگ مانگ کر گذارا کرنے کے بعد آخری عمر میں درگا نیرج پور مرنے کے لیے آجاتی ہے جہاں اُس کے بیٹے اُسے قبول نہیں کرتے اور وہ لالہ کی دکان کے تھڑے پر فوت ہو جاتی ہے۔ لاوارث لاش کو ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔ مرے ہوئے اس بزرگ کی ناراضگی کی وجہ سے پورے گاؤں میں دہشت پھیل جاتی ہے۔ زوروں کی بارش ہوتی، آندھی آتی ہے، اولے برستے ہیں، یعنی کوئی قوت ایسی ہے جو گاؤں والوں پر درگا ماں کی ناراضگی ظاہر کرتی ہے۔ رات کے وقت دھنی رام کے گھر کے دروازے پر ایک کالی کتیا دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی ہے۔ نیلیما بخار میں مبتلا ہے اور درد سے اس کا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ کتیا کی دھاڑ سے وہ کراہنا بند کر دیتی ہے۔ پھر اسے نیند آتی ہے اور صبح اس کے سسرال والے کتیا کے اس طرح ان کے گھر کے سامنے والے رونے پر بحث کرتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ نیلیما کو دہشت ہو جاتی ہے۔ نیلیما کی بیماری بڑھتی ہے اور اس کے سسرال والے یہ سوچتے ہیں کہ اس پر کسی بھوت کا سایا ہے۔ یا اُسے کسی بدروح نے قابو میں کیا ہے۔ دھنی رام اس سے کھچا کھچا رہتا ہے۔ یہاں ایک اور کہانی شروع ہوتی ہے اور ضمنی کہانیاں آگے ناول کے پلاٹ میں اپنا جواز پیدا کرتی ہیں۔ یہ کہانی نرملا دیوی کی ہے جس کی ماں کانتا دیوی کا عاشق کرم چند دولت کمانے کے لیے پردیس جاتا ہے۔ جب وہ کئی سال تک لوٹ کے نہیں آتا تو اس کی جوانی دیکھ کر اس کا باپ اس کی شادی سوہن لال سے کر دیتا ہے۔ ایک سال کے بعد نرملا کا جنم ہو جاتا ہے۔ وہ تین برس کی ہوتی ہے کہ کرم چند جھک مار کے واپس آتا ہے۔ چنانچہ کانتا اور کرم چند کے تعلقات پھر سے تازہ ہو جاتے

ہیں اور ایک دن سوہن لال انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ کر غیرت سے ندی میں کود کر جان دیتا ہے۔ وقت گذرتا ہے اور جب نرملا جوان ہوتی ہے تو کرم چند اس پر ڈورے ڈالنے لگتا ہے۔ کانتا کو یہ بات چبھتی ہے اور وہ کرم چند کو زہر دیکر موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔ کچھ برس جیل میں رہتی ہے اور چھوٹ کے نہیں غائب ہو جاتی ہے۔ نرملا لاوارث ہو جاتی ہے۔ اس کا بری طرح جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ پھر گاؤں کا ایک رنڈوا مادھو اس کے ساتھ شادی کرتا ہے۔ مگر اس کی نامردی کا راز جب کھلتا ہے تو وہ نوکری کا بہانہ بنا کر پردیس چلا جاتا ہے۔ اس کی بیوی مہینے کے مہینے پیسے بھیجتی ہے۔

نرملہ دیوی کا کردار اس اعتبار سے اہم ہے کہ اسی کے ذریعے سے کشمیر میں رہنے والا نیلیما کا مالک یعنی پاپا اس کی جان اور عزت بچاتا ہے۔ پاپا کہانی کا ایک ایسا کردار جو کہانی سے باہر ہو کر بھی کہانی کے اندر موجود ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو نرملا کے ذریعے سے نیلیما کی مدد قدم قدم پر کرتا ہے۔ شفایاب ہونے کے بعد نیلیما کی زندگی میں دہشت ناک وارداتوں کا تابڑ توڑ حملہ ہوتا ہے۔ دھنی رام اُسے پیٹتا ہے، نیلیما کو بے بسی اور بے کسی میں چھوڑ کر کیرلا جاتا ہے جہاں سے فون پر نیلیما کو ڈراتا دھمکاتا ہے اور اس پر جسم فروشی کا گھناؤنا الزام دیتا ہے۔ ادھر دھنی رام کا چھوٹا بھائی منوج نیلیما کے قریب آ کر اس کا اعتماد حاصل کرتا ہے۔ مگر آخر پر وہ بھی اپنی خصلت پر آ کر نیلیما کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔

دیوالی آنے پر نیلیما کا جیٹھ اس سے پیسوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ جب اپنی معذوری کا اظہار کرتی ہے تو چندر کانت دھمکی دیتا ہے کہ دیوالی بیت جانے کے بعد وہ پنچایت چھوڑ کر نیلیما کا بوجھ اپنے سر سے اتار پھینکے گا مگر دیوالی کی رات ایک بھیانک واردات پیش آتی ہے۔ پدما دوسری عورتوں کے ساتھ جوا کھیلنے کے لیے کسی اور کے گھر جاتی ہے۔ بوڑھے باپ اور بچوں کو

دھنی رام کی بہن کے یہاں ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔ادھر گھر میں چندر کانت کے اوباش دوست آتے ہیں اور شراب پیکر جوا کھیلنے لگتے ہیں۔ چندر کانت جب ساری پونجی ہارتا ہے تو اس کے دوست اُسے نیلیما کو داو پر لگانے کی ترغیب دیتے ہیں۔نیلیما یہ سن کر کانپ جاتی ہے اور وہ دو ہزار نکال کر چندر کانت کو دیتی ہے جو اُسے نرملا نے اس وقت دیتے تھے جب وہ کلکتہ اپنی منہ بولی بہن کے پاس تیوہار منانے کے لیے جاتی ہے۔ بہر حال چندر کانت داؤ جیت جاتا ہے مگر اس کے دوست اس کے اندر چھپے ہوئے حیوان کو جگا دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ آدھی رات کو اٹھ کر نیلیما کے کمرے میں داخل ہو کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔اس حادثے سے نیلیما دہل جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر بہنوں کے یہاں آتی ہے جہاں وہ صدمے کی وجہ سے بیمار ہو جاتی ہے۔نرملا دیوی کو خبر ہوتی ہے تو وہ فوراً چلی آتی ہے اور جب وہ نیلیما کی حالت دیکھتی ہے تو اسے سخت رنج ہوتا ہے۔ بہر حال نیلیما جب بے ہوش ہو جاتی ہے تو نرملا دیوی ہی اُسے اسپتال میں داخل کر کے اس کا علاج کرلاتی ہے اور پھر اُسی کی ترغیب پر نیلیما تھک ہار کے کشمیر میں واپس آجاتی ہے۔

فروری میں دھنی رام گاؤں آجاتا ہے۔وہ جس دن واپس جلد جاتا ہے اسی دن دور کسی گاؤں میں ایک غریب کسانی کی بیٹی لاپتہ ہو جاتی ہے۔نرملا دیوی سن کر بھونچلی رہ جاتی ہے۔

یہ ناول پڑھ کر پوری طرح محسوس ہوتا ہے کہ شفق سوپوری کی ادبی شخصیت کے اندر ایک غیر معمولی فکشن نگار موجود ہے۔وہ کہانی بننے کے ساتھ ساتھ بیانیہ کے تمام لوازمات سے باخبر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس ناول کا تانا بانا اس کے مرکزی کردار ''نیلیما'' کے اِردگرد بُن کر آدی واسی سماج کے ایسے قبائح سے پردہ اُٹھایا ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے واقعات کے حوالے سے خاکے ترتیب دیئے ہیں۔شفق سوپوری

بنگال کے آدی واسی سماج، ماحول اور گردوپیش کا مطالعہ اور مشاہدہ نیلیما کے حوالے سے اس طرح کرتے ہیں کہ کسی پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ اُن سے موضوع کے حوالے سے مناسب حالات اور واقعات جمع کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے۔ اس ناول میں شفق سوپوری نے ایک ماہر سماجیات بن کر نیلیما کے دکھ درد کو علامتی رنگ دیا ہے اور آدی واسی عورتوں کی المناک صورت حال کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے چنانچہ اس عمل میں انہوں نے اپنے محسوسات اور جذبات کی شدت کو بروئے کار لایا ہے۔

شفق سوپوری نے اس نادل میں آدی واسیوں کے سیاسی، معاشی، اقتصادی اور معاشرتی معاملات کے ساتھ ساتھ اُن کے نفسیاتی مسائل کو بھی اُبھارنے کی کوشش کی ہے مثلاً یہ کہ آدی واسی ہندوستان کی سرزمین کے اصلی باشندے ہونے کے باوجود اب تک زمین کے مالکانہ حقوق سے محروم رکھے گئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہیں اُن کے قدیم مسکن سے بے دخل کر کے اُن سے فطری تمدن چھینا گیا ہے۔ چنانچہ آدی واسیوں کی ایک بڑی تعداد روزی روٹی کے لیے گھروں سے سالہا سال تک باہر رہتے ہیں اس طرح سے وہ ایک بھاری قیمت ادا کرتے ہیں۔ شفق نے بہت خلوص کے ساتھ آدی واسیوں کے اس نفسیاتی اور معاشرتی مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ زمین کے مالکانہ حقوق سے محروم ہونے کے نتیجے میں آدی واسی جس نفسیاتی اُلجھن سے شکار ہو جاتے ہیں اُس کا سب سے زیادہ خمیازہ آدی واسی عورتوں کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس نفسیاتی مسئلے پر بھی شفق سوپوری نے روشنی ڈالی ہے۔

اس ناول میں شفق سوپوری نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ آدی واسی عورتوں کو نہ صرف یہ کہ بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ قدم قدم پر اُن کا جنسی استحصال بھی کیا جاتا ہے ناول کے زیادہ مردانہ کردار ایسے ہیں جو آدی واسی عورت کو جنسی خواہش پوری کرنے

کا ایک زود یاب ذریعہ تصور کرتے ہیں۔اس کے علاوہ آدی واسی عورتوں پر ہونے والے ظلم اور جبر کی دردناک حقیقتوں سے شفق نے نہایت موثر انداز میں پردہ اُٹھایا ہے۔رفیق راز یوں فرماتے ہیں:

> ''اس ناول کے سب زنانہ کردار کسی نہ کسی صورت میں مردوں کے استحصال کی شکار ہیں۔چنانچہ نیلیما کے ساتھ ساتھ نرملا 'سمن' کانتا دیوی اور سب سے بڑھ کر درگا ماں، یہ سب کردار آدی واسی عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی علامتیں ہیں۔ایک اور حقیقت جس کی طرف شفق نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ آدی واسی مرد جنسی معاملات میں خاندانی رشتوں کا تقدس نہیں رکھتے''۔۴۶

فنی اعتبار سے ''نیلیما'' ناول کے جملہ معیارات پر اُترتی ہے۔بقول رفیق راز اس ناول کی کامیابی کا راز قصے کی روانی اور بیان کے اختصار میں ہے جس کے لیے شفق نے جگہ جگہ پر اشاروں اور کنایوں سے کام لیا ہے۔اس ناول کے پلاٹ پر روشنی ڈالتے ہوئے رفیق راز یوں رقمطراز ہیں:

> ''اس ناول میں ایک واضح پلاٹ ہے جس کی تعمیر کرداروں اور واقعات سے کی گئی ہے۔شفق نے اپنے کردار اور ان سے متعلق واقعات اپنے موضوع کے حوالے سے کچھ اس طرح سے تراشے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے آدی واسی قوم کی ایک متحرک اور مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔شفق کے اسلوب

بیان کا کمال یہ ہے کہ اس ناول کے کردار اور واقعات کہیں بیانیہ انداز میں پیش ہوئے ہیں اور کہیں قاری خود کرداروں کے عمل اور مکالموں سے ان کی ذہنی اور نفسیاتی حالت سے واقف ہو جاتا ہے۔ قصے کے آخر پر واقعات کا منطقی اور قدرتی سلسلہ جو سارے ناول میں سرعت سے رواں دواں ہے اور قاری کے انہماک کو ایک پل کے لیے بھی ٹوٹنے نہیں دیتا۔ ہمیں ایک ایسے نتیجے تک پہنچا دیتا ہے جہاں ہم شفق کے نقطۂ نظر سے واقف ہو جاتے ہیں۔ نیلیما کے پلاٹ کی جو لی دراصل انتخاب پر مبنی ہے جو اس کے کرداروں اور نفس قصہ پر اثر انداز ہے''۔ ۴۷

شفق سوپوری اس ناول میں قصے کی ضرورت اور موقع و محل کے پیش نظر اس قدر منظر کشی سے کام لیتے ہیں جو واقعہ کے ساتھ ساتھ کرداروں کے جذبات کو تاثر کے ساتھ پیش کر سکے اور اُس کا قاری قصے کا ایک حصہ بن جائے۔ شفق سوپوری کی منظر کشی دیکھ کر اس بات کا پورا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ منظر کشی کی اہمیت بھی سمجھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر منظر کو قصے اور کرداروں کے عمل کے تابع رہنا چاہیے۔

اس ناول کے بیانیہ کی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو قصے کا ایک حصہ بنا کر اول تا آخر کہانی کے ساتھ جوڑ کے رکھتا ہے اس کے لیے شفق سوپوری نے جس لسانی دروبست سے کام لیا ہے وہ خود میں ایک انوکھی مثال ہے۔ اس ضمن میں رفیق راز لکھتے ہیں:

''شفق نے بیانیہ میں الفاظ اور جملوں اور ان کے انسلاکات کو

ایک دوسرے میں اس طرز سے پیوست کر دیا ہے کہ
کہیں تزائید لفظی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ مزید برآں اس ناول
میں قصہ خطِ مستقیم کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ اس طور پر کہ
قاری کو قصے کے کسی بھی جُزو کو حذف کر کے شارٹ کٹ اختیار
کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی''۔ ۴۸

شفق سوپوری نے اس ناول میں نہایت سلیقے سے کردار نگاری کے تقاضوں کو نبھایا ہے۔ بقول قدوس جاوید:

''یہ ناول سچے کرداروں اور اُن سے متعلق واقعات اور
سانحات پر مبنی ہے۔ اس ناول کے سبھی کردار چاہے وہ نیلیما
ہو یا دھنی رام، سچے کردار ہیں۔ اسی طرح اس ناول کے
گاؤں اور قصبے بھی حقیقی ہیں۔ لیکن شفق سوپوری نے
انہیں علامتی اور استعاراتی سانچوں میں اس طرح ڈھالا ہے
کہ نیرج پور کی آدی واسی عورتوں کا المیہ دنیا کے کسی بھی
پسماندہ علاقے کی غیر تعلیم یافتہ عورتوں کے المیے کے سانچے
میں ڈھل جاتا ہے''۔ ۴۹

شفق سوپوری نے کرداروں کا انبار جمع نہیں کیا ہے بلکہ ''نیلیما'' کو سارے واقعات کا مرکز بنا کر دوسرے تمام کرداروں کو ذیلی حیثیت بخشی ہے۔ اس ناول کے دوسرے کرداروں کی مدد سے ''نیلیما'' کی ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں شفق نے کرداروں اور واقعات کو مدنظر رکھ کر ایک ایسی زبان استعمال کی ہے جس سے اس

ناول کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔اس سلسلے میں قدوس جاوید یوں فرماتے ہیں:

''ناول کے کرداروں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے، واقعات کے بیان میں تسلسل ہے، لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس ناول میں شفقؔ نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اپنے آپ میں ایک انوکھی مثال ہے۔جگہ جگہ دیہی اور قصباتی تہذیب، گاؤں کی سماجی وثقافتی روایات اور ہندو دیومالا کے حوالے سے ایسے الفاظ اور تراکیب استعمال کئے گئے ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔صاف معلوم ہوتا ہے کہ شفقؔ سوپوری نے بڑی محنت ومشقت کے ساتھ اس ناول میں ''ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقام دارد'' پر عمل کیا ہے۔آدی واسی سماج میں مروج ایسے ایسے محاورات، ضرب المثل اور تراکیب کو برتا ہے جو کم از کم اُردو میں کسی اور ناول نگار کے یہاں نظر نہیں آتا''۔۵۰

اس سلسلے میں رفیق راز کا یہ فرمانا درست ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور زبان کی سلاست اور روانی کو برقرار رکھنے کے لیے جو محنت ومشقت شفق سوپوری نے کی ہے وہ اُن کی فنی دیانت اور ہوش مندی کی روشن دلیل ہے۔انہوں نے کئی تراکیب وضع کی ہے جس کے لیے وہ مبارکبادی کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کے بھی مستحق ہیں۔

آخر پر میں اپنی بات پروفیسر قدوس جاوید کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ:

''شفقؔ سوپوری بے شک ایک اہم ترین شاعر ہیں لیکن شاعر

ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک محقق، نقّاد، کالم نویس، فیچر نگار اور طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ یعنی شفقؔ سوپوری ایک ہمہ جہت تخلیقی فنکار ہیں جن کا قلم شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں یکساں طور پر کمال خوبیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ اور اب یہ ناول لکھ کر وہ اُردو کے فکشن نگاروں کی صف میں بھی شامل ہو گئے''۔ ۵۱

شکفتا نے

یہ ڈاکٹر شفق سوپوری کی فکائیہ تحریروں کا مجموعہ ہے جو اس وقت طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس مجموعے میں چھ مزاحیہ خاکے اور ''دل کی امیدواریاں نہ گئیں'' کے عنوان کے تحت اُن کی نیم سوانح حیات ہے۔ اس کتاب کے آخر پر ''اردو کی بالکل نئی کتاب'' کے عنوان سے اردو کے عظیم طنز و مزاح نگار، ابن انشاء کی طرز پر چھ تحریریں درج ہیں۔ شکفتا نے کی ابتداء میں پروفیسر جاوید قدوس فرماتے ہیں کہ: ''شفق سوپوری کی نثری تحریروں کے زیر نظر تحریروں کو مضمون یا انشائیے کے خانے میں رکھنا ان دونوں اصناف کے ساتھ ساتھ شفق سوپوری کی ان تحریروں کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی''۔ اسی طرح زیر مطالعہ شفق ناموں کو طنز و مزاح کے زمرے میں رکھنا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ شفق کی یہ تحریریں محض ہنسنے ہنسانے کی چیزیں نہیں ہیں اور نہ ہی شفق کا مقصد قارئین کے ہنسنے ہنسانے یا طعن و تشنیع کے سامان فراہم کرنا ہے۔ بلکہ شفق سوپوری نے اپنے سامنے اور آس پاس کی زندگی سے بعض واقعات اور کرداروں کو چن کر روزمرہ کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی نشیب و فراز کو اپنی تحریروں میں مختلف زاویوں سے آئینہ دکھایا ہے، کسی فلسفی یا مفکر، مصلح یا سیاسی رہنمائی کی طرح نہیں بلکہ بھیڑ

میں شامل ایک عام آدمی کی طرح''۔

ریاست جموں وکشمیر میں طنز ومزاح کی روایت بالکل مفقود ہے اس حوالے سے شفق سوپوری کی ان تحریروں کو ریاست میں اس نوع کی تحریروں کا نقش اول قرار دیا جاسکتا ہے۔ شفق سوپوری ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کا نام ہے۔ وہ بیک وقت ایک اہم ترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق نقاد، کالم نویس، ڈرامہ نگار، فیچر نگار اور فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طنز ومزاح نگار بھی ہیں۔ شگفتا نے میں شامل تحریریں دراصل انہوں نے اپنے دوست جناب ظفر اقبال منہاس کی فرمائش پر وادی کی ایک معروف ہفتہ روزہ ''پکار'' کے لیے لکھی ہیں۔ اگرچہ کچھ دیر بعد انہوں نے یہ سلسلہ بند کیا مگر بعد میں ''اردو کی بالکل نئی کتاب'' کے عنوان سے وادی کے ایک نمایاں روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں کئی اور کالم لکھے۔

شگفتا نے کے پیش لفظ بعنوان طیش لفظ میں شفق سوپوری دراصل اپنے والد کا خاکہ پیش کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> ''اُن کی غیر موجودگی میں گھر کے اندر سنگھ شانتی کی ساون ہوائیں چلتی تھیں۔ جس دن وہ کسی گاؤں کے لیے نکلتے تھے اُس دن شام تک ایسا لگتا تھا جیسے وہ گئے ہیں مگر اپنا رعب داب گھر میں ہی چھوڑ دیا ہے، اپنی آنکھیں وہی کسی کونے میں ہماری نگرانی کے لیے رکھی ہیں۔ پوری طرح سے احساس ہوتا تھا کہ واقعی چلے گئے ہیں۔ تو پہلے چہروں پر مسکراہٹ پھیلتی، کھنکھناتی ہنسی سنائی دیتی اور رات گئے تک قہقہے گونجنے لگتی۔ اس سکھ منڈلی کے ہیرو ہم ہوتے۔ یہیں سے ہمیں

مزاح کی لت لگ گئی۔قدرت نے ہمیں ممیکری کے فن سے
نوازا تھا جس کے لیے قصہ بیان کرنے کا ہنر سیکھنا تھا، سو ہم
نے اس میں حسبِ استطاعت مشاقی بہم پہنچائی''۔ ۵۲

شگفتا نے کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ شفق سوپوری کو نہ صرف خاکہ نگاری کے فن میں اچھی دستگاہ حاصل ہے بلکہ سوانح نگاری کا ہُنر بھی اُنہیں اچھی طرح آغا ہے۔ان خاکوں میں شفق سوپوری نے تہذیب اور شائستگی کے ساتھ نہ صرف انسانی کردار کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اُٹھایا ہے بلکہ ایک ماہر سماجیات کی طرح معاشرے کی قبیح تصویر کو بھی اُجاگر کیا ہے۔اسی طرح سے انہوں نے اپنے طرز بیان کے زور سے آپ بیتی کو جگ بیتی بنادیا ہے۔ایسا کرتے ہوئے شفق سوپوری نے طنز اور مزاح کے درمیان فرق اور توازن قائم رکھنے کے لیے ایک باشعور فکائیہ نگار کی طرح ایک مہذب لسانی رویے سے سروکار رکھا ہے۔وہ اپنے کرداروں کو تراشتے وقت اُن کی نفسیات، جذباتی ہیجان اور فکری رجحان کا خاص خیال رکھتے ہوئے اپنے جملوں کی شگفتگی سے انہیں زندہ اور متحرک بنادیتے ہیں۔چنانچہ ''عبدالسلام چوبی'' میں نقلی شاعروں، غلام الدین خیال میں ایماندار لیکن بدمزاج سرکار کارندوں ''دیباچہ پہ دیباچہ میں'' معاصر ادبی صورتحال ''کلیم اللہ'' میں ڈاکٹروں کی سفاکیت ''خواجہ صاحب'' میں نو دولتیوں کے کردار ''عارضی'' میں کام چور اور نالائق افسروں کی خرمستیوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) اس واقعے کے کچھ دن بعد بیٹے کو لکڑی کے ایک کارخانے
پر بٹھادیا۔ جہاں اُس نے کچھ ہی عرصہ میں سیب کے کھوکھے

بنانے میں مہارت حاصل کی۔ دل پر چوٹ تو لگ چکی تھی، اِدھر کیلوں کی ٹھونک ٹھانک اور آکاش وانی کے فلمی نغموں نے طبیعت میں لَے موزونیت، روانی اور فتنہ پیدا کر دیا، چند ہی دنوں میں شعر موزون کرنے لگے۔ ۵۳

(عبدالسلام چوبی)

(۲) دفتر کی جو بھی فائل اُن کے پاس آتی اُس پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھ کر بکھیڑا کھڑا کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ کسی درخواست پر یہ لکھ دیا کہ درخواست کنندہ نے جس عاجزی انکساری، خاکساری اور فروتنی وغیرہ کا مظاہرہ کیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی نیت میں کھوٹ ہے۔ لہٰذا راقم الحروم کی دانست میں شائل کا تقاضا اور مطالبہ دونوں بے جا ہیں۔ ۵۴

(غلام الدین خیال)

(۳) آپ اس صورتحال کو کلام گلفامؔ کے سوز و گداز پر محمول نہ کریں بلکہ ہمیں یہ لگا کہ جیسے ہمیں گریوں سے تیل نکالنے کی مشقت پر مامور کر دیا گیا ہے اور تیل نکالنے کے عمل کی صورت یہ ٹھہری ہے کہ ہم گریوں کو انگوٹھے پر رکھ کر شہادت کی انگلی سے تب تک مسئلے رہیں جب تک کہ تیل اس قدر کشید نہ ہو کہ ہم مٹی کا چراغ جلا کر اس کی روشنی میں گلفام کی شاعری پر منشور مرثیہ

تحریر کریں۔ ۵۵

(دیباچہ پر دیباچہ)

(۴) دونوں کے ملاحظے اور مشورے کا نچوڑ یہ ہے کہ میں کمر باندھ کر تختۂ غسل پر لیٹا رہوں۔ بازار میں میری کمر کے سائز کا کمر بند بہم نہ ہوسکا۔ کم سے کم سائز کا کمر بند کس کے باندھنے کے بعد بھی اتنی جگہ بچتی ہے کہ میں اپنا سارا ہاتھ ڈال کر پیٹ کو آسان سے کھجا سکتا ہوں..... کسی نے کہہ دیا کہ کچی اینٹ کا ٹکور تیر بہ حدف ہے۔ پورے محلے میں تلاش کرنے کے بعد کہیں سے بہم نہ ہوسکی۔ غسل خانے کی دیوار سے ایک پکی اینٹ نکالی گئی۔ اب نہ باغوں میں وہ جھوٹے پڑتے ہیں جن میں جوانی دیوانی ہچکولے کھاتی تھی نہ گھروں میں وہ چولہے جلتے ہیں جن میں ٹکور کے لیے اینٹ سینکی جاتی تھی۔ ناچار بیگم نے گیس چولہے پر اینٹ کو آتشین بنا دیا ع

جُز گیس کوئی نہ آیا بروئے کار

اونی کپڑے کے بجائے میری پرانی قمیص میں باندھ کر لائیں تو ٹکور کے دوران اینٹ قمیص کو سوراخ کر کے سیدھے کمر کو جا لگی جیسے پالتھین کے لفافے سے انگارہ نکلتا ہے۔ کمر بری طرح جھلس گئی، چھالے پڑ گئے، اب ڈِسک بھول گیا ہوں، سوختگی کا علاج کروا رہا ہوں ع

ٹک میر کمر سوختہ کی جلا خبر لے ۵۶

(کلیم اللہ)

(۵) خواجہ صاحب پیدائشی بیمار تھے، ہر وقت پیٹ میں گیس، معدے میں تیزاب، دل میں کینہ اور منہ میں گالی رہتی تھی۔ ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے۔ ایک بار شروع ہونے کے بعد کئی گھنٹوں تک معتوب کی ساتھ پشتوں کو قبروں سے نکال نکال کر اُن کی ہڈیوں سے گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ کبھی دوا اور غصے میں ناغہ نہیں کیا۔ اُن کی گالیاں طبع زاد اور دور رس ہوتی تھی۔ ماہ صیام میں البتہ فارسی گالیاں زیر لب دیتے تھے۔ کسی نے کہہ دیا کہ گالی گلوچ سے روزے مکروہ ہو جاتے ہیں اس پر خواجہ صاحب نے کہا بجا کہیے ہو مگر تب جب دشنام شنیدنی ہو۔ ۵۷

(خواجہ صاحب)

(۶) آفیسر کا کہنا ہے کہ جس کمرے میں شبانہ چھاپہ ڈالا گیا وہاں سے بالترتیب حسینائیں، موصوف اور فراق گورکھپوری کے شعری مجموعے برآمد ہوئے۔ ۵۸

(عارضی)

شفق سوپوری کے مضحک خاکے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ طنز و مزاح کے ان تمام حربوں سے کمال ہنرمندی سے کام لیتے ہیں جو اس فن میں لازمی ہیں۔ مثلاً موازنہ، مبالغہ،

لفظی ابہام گوئی، تحریف، تقلیب وغیرہ جیسی صفتوں سے وہ اپنے طنز کی دودھاری تلوار کی کاٹ کو تیز کر کے ایسے وار کرتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ زر پر کوئی ہے اور چوٹ کس نے کھائی ہے۔ ان خاکوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شفق سوپوری کی نظر معاشرہ اور معاشرے کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر ہے اور وہ اپنے طنزیہ لہجے کے نشتروں سے اپنے کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کو کہیں بعینہٖ اور کہیں مبالغہ کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر کے ایک لطیف مزاح کو تخلیق کرتے ہیں۔

اس کتاب کا اہم باب ''دل کی امیدواریاں نہ گئیں'' جو دراصل شفق سوپوری کے کچھ سوانحی کوائف کا ایک مضحکہ خیز خاکہ ہے۔ شفق سوپوری اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ اعلیٰ طنز و مزاح اُسی وقت پیدا کیا جا سکتا ہے جب مزاح نگار اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنانے کی ہمت پیدا کرے۔ اردو میں اس کی اعلیٰ مثالیں مشتاق احمد یوسفی کے ہاں ملتی ہیں۔ شفق سوپوری جگہ جگہ پر اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنا کر دراصل ذات کی شکستگی کو انسانی اسمیہ کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس:

> ''انٹرویو میں آپ نے کہا تھا کہ آپ شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ عاشقی شاعری کی غذا ہے، تو آپ عشق فرماتے ہوں گے، اچھا یہ بتائیے کہ آپ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو صفحۂ قرطاس پر بھی اُتارتے ہیں یا پھر سینہ بہ سینہ ہی منتقل کر رہے ہیں (سینہ بہ سینہ کہتے وقت انہوں نے آنکھ جاری تھی) سُنیے یہ پبلک سکول ہے کوئی دبستان نہیں جہاں آپ کے نالے سن کر بلبلیں غزل خواں ہو جائیں گی۔

یہاں کی زمینوں میں طبع آزمائی کرنے سے اجتناب کریں اور
یہ جو آپ نے شانوں پر گھنگور زلفیں پریشان رکھی ہیں ہر چند کہ
ایسا اگلے زمانوں میں شہزادی، فلسفوں، مفکروں، فنکاروں اور
دانشوروں کا وطیرہ تھا مگر اس دور میں نقلی درویش، چرسی اور
مجذوب ہی گیسو دراز ہوتے ہیں۔ امید ہے آپ سب سمجھ گئے
ہوں گے''۔۵۹

دل کی امیدواریوں میں دراصل شفق سوپوری نے اپنی ذات کو آئینہ بنا کر پبلک سکولوں کی بدعنوانیوں اور خرابیوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ چنانچہ سکول چپراسی سے لے کر ادارے کے منتظمین تک مثلاً مولوی محمد ابراہیم کے علاوہ خود شفق سوپوری کے چاچا، ادارے کے سیکرٹری، ماسٹر عبدالکبیر، مولوی محمد انور، پیرزادہ ماسٹر سعید الدین، ماسٹر شاہ عبداللطیف، پرنسپل، چپراسی، سید نور محمد بخاری، پروفیسر سندر لال رازدان، وغیرہ ہمارے معاشرے کے ایسے کردار ہیں جن میں سے کئی کسی نہ کسی سطح پر معاشرے کی اخلاقی اور سماجی قدروں کے تنزل کی وجہ بنتے ہیں اور بعض کردار اس تنزل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی المناک صورتحال کے شکار بن جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو شفق سوپوری اپنے طنز کا وار اپنے عہد کی سماجی، ادبی، اخلاقی قدروں پر کرتے ہیں اس سلسلے میں اُن کے مضامین ''پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا''، ''میری ناف ٹل گئی''، ''مکھی''، ''بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا'' اور ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں'' سے عمدہ مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جیسے:

(ا) ''مولوی محمد انور کے چارج شیٹ مندرج تھا کہ قوت
سماعت میں خلل کی وجہ سے سکول کی گھنٹی سننے سے قاصر ہیں

اور وفود نسیاں سے بار بار ایک نئی کلاس میں منہ اُٹھائے چلے جاتے ہیں، کئی بار انتساع کیا گیا کہ چوڑی دار پاجامہ پہننا ترک کریں کیونکہ اس سے گھٹنوں کا کج اور ٹانگوں ضعف نمایاں ہوتا ہے جس سے بچوں کی نفسیات پر برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں''۔ ۶۰

(مولوی محمد انور)

(۲)''جواب میں سعد الدین نے لکھ دیا کہ حیوان کے جرم میں انسان کو دھر لینا سراسر غیر قانونی ہے۔ گائے کوئی انسان نہیں کہ بہلا پھسلا کر یا خوف زدہ کر کے سمجھایا جائے۔ راقم الحروف نے اس سے قبل بھی سیکرٹری صاحب سے معذرت کی جو انہوں نے قبول بھی فرمائی کیونکہ وہ بھی موصوفہ کے شیر (خوار) ہیں''۔ ۶۱

(گاؤ زوری)

(۳)'' کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کتے ایڈمنسٹریٹر کی نظروں میں ہمیں ذلیل وخوار کرنے کی غرض سے ایسی حرکات جان بوجھ کر کرتے ہیں۔ ایک صاحب تو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اُس نے عین اُس وقت جب ایڈمنسٹریٹر کتوں کی بدمعاشیوں کی وجہ سے ہم پر دھاڑ رہے تھے دیکھا کہ کتے ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے اشارہ کر دیتے تھے، واللہ اعلم بالصواب،

آپ سراسیمہ کیوں ہو گئے''۔ ۶۲

(کام گئے کا بقدر لب دندانے نکلا)

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کتاب میں ''اردو کی بالکل نئی کتاب'' کے عنوان سے پانچ مختصر مضامین شامل ہیں اور یہ اردو کے عظیم طنز و مزاح نگار ابن انشاء کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ دراصل شفق سوپوری نے موضوعات کے پردے میں عام انسانوں کی کشمکش، نا اُمیدی اور بے کسی کی تصویر پیش کی ہے۔ ''اُردو کی بالکل نئی کتاب'' کے آغاز میں شفق سوپوری یہ تنبیہ کرتے ہیں:

''یہ نصاب صرف ریاست جموں وکشمیر کے لیے مرتب کیا گیا ہے اس کے جملہ حقوق مصنف کے پاس بالکل محفوظ نہیں، نیز مصنف کا اپنے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں ہے'' ۶۳

غور کیا جائے تو جموں وکشمیر ایک ایسی ریاست ہے جہاں رشوت خوری، انتظامی بدعنوانی اور لوٹ کھسوٹ عروج پر ہے۔ چنانچہ یہاں کے عوام بجلی، پانی، تیل خاکی، راشن اور گیس وغیرہ کی عدم فراہمی کے نتیجے میں گوناگوں مشکلات سے دوچار ہیں۔ شفق سوپوری ان مشکلات سے جھنجلا کر انتظامی مشنری کے خلاف بلاواسطہ الفاظ میں احتجاج نہیں کرتے بلکہ مزاح کی کمان سے طنز کا ایسا تیر چھوڑتے ہیں کہ کمان کی جھنجھناہٹ، تیر کا زناٹا اور نوک کی چبھن پورے معاشرے میں اپنی اپنی سطح پر سلسلاہٹ پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہمارے یہاں جب پانی کی عدم فراہمی کے خلاف عوام

سڑکوں پر آخر خالی برتنوں کو ٹھٹھنا کر احتجاج کرتے ہیں جس پر پولیس والوں کا ماتھا ٹھنکنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی پت کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ ۶۴

(پانی)

(۲) مٹی کے تیل نے بعض خوش بختوں کو اس قدر آسودہ بنایا ہے کہ وہ زمین سے تیل نکالنے کے پلانٹ لگا سکتے ہیں۔ ۶۵

(زمین)

(۳) حکیم ابن انشا نے گیس کی شکایت دور کرنے کے لیے جو نسخہ تجویز کیا ہے۔ اس کے استعمال کی ترکیب الٹی ہے، اسی لیے گیس کی پرابلم نے وبائی صورت اختیار کی ہے۔ گھر کے مرد کو چاہیے کہ وہ حکیم کا نسخہ اپنے بجائے گھر والی پر آزمائے۔ انشاءاللہ افاقہ ہوگا۔ ۶۶

(گیس)

(۴) عزیزو! ہمارے یہاں شاعروں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ایک افسر شاعر دوسرا غیر افسر شاعر۔ افسر شاعر وہ ہوتا ہے جسے ثقافتی ادارے سر پر نقاد پلکوں پر اور کوے طبلے پر بٹھاتے ہیں۔ اسی لیے مغل خاندان کے آخری چشم و چراغ نے تمنا کی تھی ؎

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا

یا مرا ہاج گدایا نہ بنایا ہوتا

(شاعر)٦٧

(۵)سنا ہے ہماری سیاسی پارٹیوں کے زعماء نے اگلے چناؤ نشان کے طور پر موم بتی، چراغ، ٹارچ، ماچس، چاند ستارے اور اس قبیل کی چیزوں کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ ہمارے سیاسی رہنما جانتے ہیں کہ جب تک بانس کے جنگل اکیں گے، بانسری بجتی رہے گی۔٦٨

(بجلی)

بہرحال شفق سوپوری کی فکائیہ تحریریں طنز ومزاح کے معیار پر پوری طرح سے اُترتی ہیں۔اور بقول قدوس جاوید ''شفق نے اپنے ان تحریروں میں صدیوں پر محیط اُس اقداری نظام کی بازیافت کی کوشش کی ہے جو اقداری نظام ہمارے ماحول اور معاشرے کی ہمہ جہت تمانیت کا ضامن تھا۔قدوس جاوید صاحب مزید کہتے ہیں کہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شفق سوپوری نے ان تحریروں کی تخلیق کسی فلسفہ یا نظریہ کی تبلیغ یا پروپگنڈہ کے لیے نہیں کی ہے۔ اس لیے ان تحریروں کا لب ولہجہ شگفتہ ہے جو اپنی لسانی ساخت کی بنا پر ایک طرف جہاں قاری کے اعصاب کو گدگداتا ہے وہیں دوسری جانب ان تحریروں کی زیریں لہریں قاری کو اپنی معتبر اور محترم قدروں کی بازیافت کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب بھی دیتی ہیں۔

حواشی

۱: اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی، شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۱ء، ص ۸

۲: ایضاً، ص ۹

۳: ایضاً، ص ۱۱

۴: ایضاً، ص ۹۷

۵: ایضاً، ص ۱۰۳

۶: ایضاً، ص ۱۱۷

۷: ایضاً، ص ۱۱۹

۸: سہ ماہی: انتساب عالمی (سرونج) اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء

۹: موسیقی، شاعری اور لسانیات، ڈاکٹر شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۲ء، ص ۱۰

۱۰: ایضاً، ص ۲۳۔۲۴

۱۱: ایضاً، ص ۴۰

۱۲: ایضاً، ص ۴۱

۱۳: ایضاً، ص ۴۲

۱۴: ایضاً، ص ۴۳

۱۵: ایضاً، ص ۴۵

۱۶: ایضاً، ص ۴۹

۱۷: ایضاً،ص ۶۲

۱۸: ایضاً،ص ۱۰۶

۱۹: ایضاً،ص ۱۱۱

۲۰: ایضاً،ص ۱۱۱۔ ۱۱۲

۲۱: کلام فیض کا عروضی مطالعہ: ڈاکٹر شفق سوپوری،ص ۷

۲۲: ایضاً،ص ۴۶۔ ۴۷

۲۳: ایضاً،ص ۱۰۵۔ ۱۰۶

۲۴: ایضاً،ص ۱۳۳۔ ۱۳۴

۲۵: ایضاً،ص ۱۴۷

۲۶: غ۔م۔طاؤس: فن اور شخصیت، شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۴

۲۷: ایضاً،ص ۶۹

۲۸: مخزنِ موسیقی، ڈاکٹر شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۵۵۔ ۵۶

۲۹: ایضاً،ص ۶۸

۳۰: ایضاً،ص ۷۰

۳۱: جہات، ڈاکٹر شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۲، ص ۱۷

۳۲: ایضاً،ص ۲۲

۳۳: ایضاً،ص ۲۹

۳۴: ایضاً،ص ۳۰

۳۵: ایضاً، ۳۴

۳۶: ایضاً،ص ۴۰

۳۷: ایضاً،ص ۵۰

۳۸: ایضاً،ص ۶۱

۳۹: ایضاً،ص ۶۳

۴۰: ایضاً،ص ۶۷

۴۱: ایضاً،ص ۷۷

۴۲: ایضاً،ص ۸۴

۴۳: ایضاً،ص ۸۸

۴۴: ایضاً،ص ۱۰۲

۴۵: نیلیما، ڈاکٹر شفیق سوپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱۔ ۱۲

۴۶: ایضاً،ص ۲۱

۴۷: ایضاً،ص ۲۲

۴۸: ایضاً،ص ۲۴

۴۹: ایضاً،ص ۱۲

۵۰: ایضاً،ص ۱۳

۵۱: ایضاً،ص ۱۱

۵۲: چونکہ یہ کتاب ابھی زیرِ طباعت ہے لہٰذا تمام حوالے ہفتہ روزہ ''پکار'' اور روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' سرینگر کشمیر سے ہی دیئے جائیں گے۔

۵۳: ہفتہ وار ''پکار'' سرینگر کشمیر، شمارہ یکم جنوری یا ۷ جنوری ۲۰۰۹ء

۵۴: ایضاً، ۸ تا ۱۴ جنوری ۲۰۰۹ء

۵۵: ایضاً، ۱۵ تا ۲۱ جنوری ۲۰۰۹ء

۵۶: ایضاً، ۲۲ جنوری تا ۲۸ جنوری ۲۰۰۸ء

۵۷: ایضاً، ۲۹ جنوری تا ۴ فروری ۲۰۰۹ء

۵۸: ایضاً، ۱۲ تا ۱۸ فروری ۲۰۰۹ء

۵۹: ایضاً، ۱۶ تا ۲۹ اپریل ۲۰۰۹ء

۶۰: ایضاً، ۲۹ تا ۲۵ مارچ ۲۰۰۹ء

۶۱: ایضاً، ۲۸ مئی تا ۳ جون ۲۰۰۹ء

۶۲: ایضاً، ۲۸ مئی تا ۳ جون ۲۰۰۹ء

۶۳: روزنامہ کشمیر عظمیٰ ۳۰ ستمبر ۲۰۱۲ء

۶۴: ایضاً، ۷/ اکتوبر ۲۰۱۲ء

۶۵: ایضاً، ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۲ء

۶۶: ایضاً، ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۲ء

۶۷: ایضاً، ۶ دسمبر ۲۰۱۲ء

۶۸: ایضاً، ۳۰ ستمبر ۲۰۱۲ء

باب ششم

شفقؔ سوپوری کے ہمعصر شعراء واُدباء

افتادِ وقت کے ساتھ تہذیب اور سماج بھی بدل جاتے ہیں۔ شاعر اور ادیب اسی تبدیلی کے متزاج کے مطابق اپنے خیالات اور تصورات کے معیار قائم کرتا ہے۔ جدیدیت کے اختتام پر بعض مبصرین نے کہا تھا کہ غزل کا بالکل ہی کباڑا ہو گیا ہے۔ یہ خیال بھی عام تھا کہ غزل کی زبان و بیان دونوں کلاسیکی نظر سے دیکھنے والوں کی نظر میں مائل بہ انحطاط ہیں لیکن قنوطیت اور زندگی سے لاتعلقی کے باوجودی تصور کے باوجود جدیدیت نے غزل کے نئے سفیر کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ چنانچہ شہریارؔ، ندا فاضلیؔ، باقی، عرفان صدیقی، ظفر اقبالؔ، احمد مشتاق، شکیب جلالی، محمد علویؔ، مظہر امامؔ وغیرہ کی موجودگی میں ہم ہرگز یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب نہیں کہ جدیدیت کے اختتام پر غزل کا کباڑا ہو گیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج کی اٹل حقیقت ایک سائنسی اور تکنیکی انقلاب سے تعبیر ہے۔ اس انقلاب نے گذشتہ صدی کی کوکھ سے جنم لیا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے کرۂ ارض کو گلوبل ولیج بنا دیا اور اب کوئی بھی واردات، واقعہ یا تجربہ نہ تو شخصی ہے، نہ انفرادی اور نہ علاقائی۔ انسانی علم و شعور کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئی ہیں جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر ادب میں جدید تر حسّیت اور رویوں کے خدوخال ابھرنے لگے ہیں۔ انسانی تہذیب اور تمدن کے ساتھ ساتھ احساس ادراک کی وحدت بھی سامنے آ رہی ہے۔ اس کے باوجود جن خدشات کا اظہار گذشتہ صدی میں اُردو غزل کے حوالے سے کیا گیا تھا کہ غزل کی رمزیت اور اشاریت کی تہہ داری ختم ہو سکتی ہیں۔ معاصر غزل نے ان خیالات کو باطل مشابت کر دیا۔

یوندر اسر نے کہا تھا کہ اکیسویں صدی میں پرنٹ میڈیا ناپید ہو جائے گا اور ساری دانشورانہ فکر ایک چھوٹے سے کیپسول میں بند ہو جائے گی جس کو پھیلا کر ہم جب چاہیں، اس سے استفادہ کریں گے۔ ہم سب اس بات کے گواہ ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ

پرنٹ میڈیا نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور نہ دانشورانہ فکر کسی کیپسول میں بند ہو گئی ہے۔ بلکہ آج کل سوشل میڈیا کے ذریعے دانشورانہ فکر کا بڑے پیمانے پر اظہار کیا جا رہا ہے۔ بیسویں صدی البتہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے حیرت انگیز پیش رفت کی ہے، اُس سے ہمارا اخلاقی معیار، طرز تمدن اور کلچر بہت حد تک متاثر ہوئے اور ہمارے ادب کو ہی نہیں عالمی ادب کو بھی چیلنج درپیش ہوئے۔

اردو غزل کی تاریخ انقلابوں سے بھری پڑی ہے۔ کلاسیکی دور سے لے کر ترقی پسند دور تک اور پھر آزادی کے بعد اُردو غزل نشیب و فراز سے گزرتی رہی۔ اس کے بعد جدیدیت جو ایک رجحان سے زیادہ تحریک کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ تقریباً ہر دور میں غزل کے سامنے چیلنج آ گئیے مگر غزل میں جو فنی استحکام، روایت کی پاسداری، لہجے کی تہداری، ہیئتی امتیاز، فنی وسعت کے اوصاف ہیں انہوں نے اس چراغ کو بجھنے نہ دیا۔ اس دور میں بھی جب تیز رفتار زندگی، گلوبلائزیشن، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ نے کئی چیزوں کی بقا کو خطرے میں ڈالا ہے۔ غزل لکھی جاتی ہے، پڑھی جاتی ہے، گائی جاتی ہے، سُنی جاتی ہے، سمجھی جاتی ہے، سمجھائی جاتی ہے اور مسلسل چھاپی جاتی ہے۔ شاعروں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس امر کی گماز ہے کہ معاصر غزل نے اپنے وجود کی بقا کے سارے سروسامان پیدا کئے ہیں۔

ثقافتی سطح پر ہم ایک ایسے دور میں ہیں جسے مابعد جدیدیت کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت میں ہر تخلیق کار کو یہ آزادی میسر ہے کہ وہ کسی بھی رویے، رجحان اور تحریک سے خود کو وابستہ کر کے اپنی تخلیقی سرگرمی جاری رکھ سکتا ہے۔ ساتھ ہی تخلیقی وجود منوانے کے لیے وہ کسی بھی نظریئے کے جبر کو قبول نہ کرنے کا بھی مختار ہے۔ جدیدیت کے اختتام پر اُردو غزل کو ایسے تازہ فکر شاعروں کی ضرورت تھی جو اسے تقلید، تکرار اور یکسانیت سے نجات

دلا کر اپنی فنی بصیرت سے جدت موضوع اور ندرت بیان کے نئے راستوں سے آشنا کرا سکتے۔ جدیدیت میں غزل میں جس موڑ پر فکر و نظر کے نئے جہانوں اور تخلیق کے نئے تقاضوں سے محروم ہو کر محض نئے موضوعات کے دائرے میں قید ہو کر رہ گئی تھی وہاں تخیل اور حسّیت کی ضرورت محسوس کی گئی، کیونکہ جدیدیت میں غزل جن نمائندہ موضوعات میں سمٹ گئی تھی وہ زمانی معنویت سے خالی ہو چکے تھے یعنی ایک طرح سے غزل اپنی شناخت کا سفر ختم کر چکی تھی۔ اس احساس نے مابعد جدیدیت غزل کے لیے راستے ہموار کر دیئے اور نئی نسل نے جن شعراء نے اپنی شاعری کی شناخت کے لیے نئی طرز، نئے معیارات، نئی فکر، نئے رجحانات اور نئے رویوں کی تلاش میں اپنی فنی اور لسانی بصیرت نیز ثقافتی شعور سے کام لینا شروع کیا ان میں جموں و کشمیر کے تازہ فکر شعراء کا نام آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ جموں و کشمیر میں حامدی کاشمیریؔ، فاروق نازکی، ہمدم کاشمیری، مظفر ایرج، حکیم منظور وغیرہ نے جدیدیت کے اپنے سفر میں فکری اور فنی سطح پر کئی کامیاب تجربے کر کے آنے والی نسل کے لیے ایک روشن روش چھوڑ دی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جدید شعراء موضوعاتی سطح پر تنگ دامانی کا شکار ہو گئے اور ساتھ ہی اسلوبیاتی سطح پر ان کے یہاں علامتوں اور اُن کے تلازموں کی تکرار سے اکتاہٹ اور بیزاری کا احساس ہونے لگا۔ ان کے بعد کے شعراء نے جو فکری اعتبار سے کسی تحریک، نظریئے یا خاص رجحان کے پابند نہیں، اپنے فنی، سماجی اور ثقافتی شعور کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے اجتماعی احساسات اور جذبات کی نمائندگی کا پورا اہتمام کیا ہے۔ مثلاً رفیق رازؔ، نذیر آزادؔ، شفق سوپوریؔ، خالد بشیر، فرید پربتیؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ، ایاز رسول نازکیؔ، احمد شناس اور بالکل تازہ شعراء میں لیاقت جعفری اور شیخ خالد کرار کے یہاں تخلیقی اقدار کو استوار بنانے کے لیے سماجی اقدار سے اخذ و استفادہ اور اسلوب بیان کی سلاست اور شفافیت کا عمل

جاری وساری ہے۔ان شعراء کو کسی بھی نظریئے، اصول، تحریک یا رجحان کا پابند قرار نہیں دیا جاسکتا۔اگرچہ ان میں رفیق رازؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ اور بعد میں شفق سوپوری ''شب خون'' میں کثرت سے چھپتے رہے مگر انہوں نے ہمیشہ ''شب خون'' کے نظریاتی رجحان کے بجائے اس کے معیار کو ملحوظ نظر رکھا۔پھر یہ بات بھی ہے کہ نظریئے جملہ حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ نظریئے سے باہر جو حقیقتیں رہ جاتی ہیں انہیں کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ معاصر غزل حقیقت پسندانہ فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔یہ حقیقتیں معاصر سماجی اور تمدنی اقرار سے تعلق رکھتی ہیں۔اس حقیقت نے ہمارے معاصر شعراء کو کسی بھی ادبی تھیوری یا رویے کا پابند ہونے نہ دیا بلکہ وہ زندگی سے قریب تر ہونے کی ضرورت کو محسوس کر چکے ہیں۔یہی سبب ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی وہ اپنے اصولوں کو تسلیم کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

موضوعاتی سطح پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء کے یہاں چند بندھے ٹکے موضوعات کی تکرار ملتی ہے۔ان موضوعات کی نسبت سے مخصوص لفظیات نے جنم لیا مثلاً کسان، کھیت، کارخانہ، مزدور، مشین، استحصال، ظلم و جبر، زندان، زنجیر اور اس قبیل کے کتنے ہی الفاظ ہیں کتنی ہی علامتیں ہیں جن کے تلازمات میں ترقی پسند ادب محصور ہو کر رہ گیا۔اسی طرح جدیدیت نے اس کے برخلاف داخلیت پر زور دیا جس کے نتیجے میں ایک خاص قسم کا ڈکشن وجود میں آیا۔مثال کے طور پر تنہائی، کرب، احساس، بے چہرگی، آوارگی، ذات کا المیہ یہ سب ایک فارمولے کی صورت میں جدید غزل گو شعراء کے یہاں استعمال ہوتے رہے۔ بیان کی سطح پر بھی ترقی پسند شعراء کے یہاں راست بیان پائی جاتی ہے جب کہ جدیدیت میں اس کی جگہ علامت نگاری نے لے لی۔مابعد جدید غزل میں موضوع یا بیان کی کوئی قید نہیں۔

معاصر غزل کسی بھی موضوع کو خارجی یا داخلیت کے ساتھ عصری حسّیت کے اظہار کا وسیلہ بنا سکتی ہے۔ چنانچہ ہمارے معاصر شعراء میں تنہائی بھی موجود ہے، مزدور بھی اور شکست ذات کا المیہ بھی۔ ترقی پسند فکر بھی، جدیدیت کا رجحان بھی اور روایت کا احترام بھی۔ یہ سب کچھ ہے مگر کسی قسم کے جبر یا شدت کے بغیر۔

۱۹۹۰ء کے بعد خصوصاً وادی کشمیر کے شعراء میں ایک نئی طرح کی تبدیلی آئی۔ تقریباً بیس بائیس برس تک جاری رہنے والی شورش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کی جزئیات کو کہیں راست تو کہیں علامتی پیرایہ اظہار میں بیان کرنے کا عمل شروع ہوا۔ کشمیر کے سیاسی حالات کی گونج اگرچہ غیر کشمیری شعراء کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے لیکن کشمیر کے شعراء میں ان حالات اور واقعات کی علامتی قوت زیادہ مستحکم ہے۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ سیاسی حالات میں انتشار کی وجہ سے یہاں کا ثقافتی، تاریخی، سماجی، اخلاقی، اقتصادی، معاشی اور تمدنی منظرنامہ بھی تیزی سے بدلنے لگا۔ چنانچہ آج کے شاعر نے جن المناک واقعات کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے ان کے اظہار کے لیے ایک نئے قسم کا علامتی اور استعاراتی نظام وجود میں آیا۔ ان حالات کے علامتی اظہار کے ساتھ ساتھ مابعد جدیدیت غزل میں کئی دیگر وقوعات کے علاوہ تہذیبی، تمدنی، تاریخی اور ثقافتی تشخص کے مسائل بھی سامنے آنے لگے۔

وہ زعفران وہ چشمے وہ گلزار کیا ہوئے
آگ آئے ہیں ہزاروں عقابر زمین پر
(رفیق رازؔ

مجھ پہ اطراف و جوانب سے چلا ہے تیر

یہ مرا پختہ یقین ہے کہ مرا لشکر ہوگا
(نذیر آزادؔ)

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم
(خالدؔ بشیر)

جائے حیرت اس نئی تہذیب میں موجود ہے
اِک پرانا سا کھنڈر اونچے گھروں کے درمیان
(پرتپال سنگھ بیتابؔ)

جلنا ہر آشیانے کا بجلی سے ناگہاں
بچنا چمن میں طائروں کے بال باب پر
(شفق سوپوری)

معاصر غزل کے رویوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شفق سوپوریؔ کے معاصر شعراء پر روشنی ڈالی جائے گی جو اس باب کا عنوان ہے۔ ڈاکٹر شفق سوپوریؔ کے معاصرین میں سب سے پہلے ''رفیق رازؔ'' کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

رفیق راز کا اصل نام رفیق احمد اور رفیق رازؔ قلمی نام ہے۔ آپ ۱۰ مارچ ۱۹۵۰ء کو براری پورہ سرینگر میں مرحوم خواجہ علی محمد شمراک کے گھر پیدا ہوئے۔ رفیق رازؔ کی مختصر سوانحی کوائف پر ڈاکٹر شفق سوپوری رقمطراز ہیں:

''رفیق راز کا اصل نام رفیق احمد ہے۔ ان کے والد گرامی خواجہ علی محمد شیمراک تھے۔ خواجہ علی محمد شیمراک معزز شہریوں

میں شمار ہوتے تھے۔مرحوم جموں وکشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں جنرل منیجر کے عہدے پر سبکدوش ہوئے۔راز کی والدہ ماجدہ حاجرہ بیگم شہر سرینگر کے معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔خواجہ علی محمد کی گیارہ اولادیں ہیں۔چار بیٹے اور چھ بیٹیاں ایک بیٹی کا بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے۔رفیق راز کی ولادت ۱۹۵۰ء کو شہر سرینگر کے براری پورہ عیدگاہ علاقے میں ہوئی۔بچپن چمر دوری دلال محلہ میں گذرا۔۱۹۵۶ء میں سرینگر کے معروف مشنری سکول ٹینڈل بسکو میموریل میں داخل ہوئے۔جہاں سے انہوں نے ۱۹۶۳ء میں میڈل پاس کیا۔ اس کے بعد آپ نے مشن سکول فتح کدل سے ۱۹۶۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اعلیٰ تعلیم کے لیے سرینگر کے سری پرتاب کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۷۳ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔اسکے بعد کشمیر یونیورسٹی سرینگر سے ۱۹۷۶ء میں ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔رفیق راز کی شادی خانہ آبادی شہر سرینگر کی ایک معروف شخصیت خواجہ عبدالاحد لون کی صاحبزادی یاسمین بانو سے ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔راز کی تین اولادیں ہیں۔ایک صاحبزادہ فیضان رفیق انجینئرنگ کی تربیت حاصل کر رہا ہے۔دو صاحبزادیاں حائفہ رفیق اور صاعقہ رفیق زیر تعلیم ہیں۔رفیق

راز نے شعبۂ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی میں ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۲ء تک لیکچرر کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیئے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کا تقرر ریڈیو کشمیر سرینگر میں پروگرام ایکزیکٹیو کی حیثیت سے ہوا۔ ترقی کی مختلف منازل طے کر کے پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر، بعد میں ڈپٹی ڈائریکٹر اور آخر پر ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ اس دوران انہوں نے لیہہ اور کرگل میں بھی اپنے فرائض منصبی انجام دیئے۔ آپ نے عمرہ کے سلسلے میں ۱۹۹۴ء میں سعودی عرب کا سفر کیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں قومی کل لسانی مشاعرے میں کشمیری زبان کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ متعدد ریاستی اور کل ہند مشاعروں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ آپ وادی کی دو اہم ادبی اور لسانی انجمنوں بزم شعراء اور کاشر محاذ کے صدر رہنے کے علاوہ ۱۹۸۹ء۔ ۲۰۰۲ء تک ساہتیہ اکادمی دہلی کے ایڈوائزری بورڈ کے رکن اور بورڈ ممبر رہ چکے ہیں''۔ا

اس بیان کی تائید میں محمد یوسف خان عادل یوں لکھتے ہیں:

''رفیق راز سرینگر کے ایک محلہ براری پورہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے ۱۹۷۶ء میں اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے نئی دہلی کے قومی مشاعرے میں بحیثیت کشمیری

شاعر کے کشمیری زبان کی نمائندگی کی۔ راز صاحب پہلے کشمیر
یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیر میں لیکچرر رہے، پھر ریڈیو کشمیر
میں معاون پروڈیوسر مقرر ہوئے اور اس طرح کئی عہدوں پر
اپنے فرائض منصبی انجام دیئے''۔ ۲

رفیق رازؔ وادی کشمیر کے نمائندہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا ہے۔ وہ ابتداء میں فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے اور نثر لکھتے تھے اور پھر کشمیری زبان اور اُردو کی طرف مائل ہوئے۔ رفیق رازؔ فی الوقت کشمیری زبان اور اردو زبان کو ہی اظہار کا وسیلہ بنا رہے ہیں۔ ان کی اب تک چھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں تین اردو شعری مجموعہ انہار، مشراق اور نخل آب شامل ہیں۔ کشمیری زبان میں ''نے چھ نالان'' دستاویز اور ایک تنقیدی کتاب ''کاشِر زبان شاعری تہ عروض'' شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ رفیق رازؔ نے دونوں زبانوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کا کلام اردو کے تقریباً سبھی نمایاں اور قابل قدر رسالوں کی زینت بنتا آ رہا ہے خاص طور سے ''شب خون'' میں متواتر طور پر چھپتے تھے۔ اس کے علاوہ مباحثہ، تحریک ادب، شاعر، آج کل، اثبات، نئی کتاب، انتساب وغیرہ رسالے قابل ذکر ہیں۔

رفیق راز کے ابتدائی کلام پر فارسی کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے شاعری کی ابتداء فارسی شاعری ہی سے کیا ہے اور بعد کو وہ کشمیری اور اردو زبان کی طرف راغب ہوئے۔ رفیق راز کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی تخلیقی فکر انہیں معاصر شعراء سے الگ کر دیتی ہے۔ بقول محمد یوسف ٹینگؔ:

''شاعر کی ایک بڑی آزمائش اس وقت ہوتی ہے جب وہ

مانوس اور پامال لہجوں کی دلدل سے نکل کر انہی الفاظ میں نئی روش تلاش کرنا چاہتا ہے، جو معنی کی ہم رنگی اور تہہ نشینی کے باوجود تازہ مہک پیدا کر سکیں اور ان سے نئی راگنیوں کے سر ابلنے لگیں۔ ایسے لمحات میں خیال زندہ ہو کر سانس لینے لگتے ہیں اور لفظ انگاروں کی طرح دہکنے لگتے ہیں یہ دراصل شاعر کی اپنے میڈیم پر مکمل قدرت اور نصرت کی آیینہ دار ہوتی ہے۔ رفیق رازؔ اس کسوٹی پر سچا نکلتا ہے''۔ ۳

رفیق رازؔ جدید غزل گو ہیں اور ان کی فنی اور فکری شعور نے انہیں ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ وہ شاعری کی اخلاقی قدروں کو زماں و مکاں کے ادراک کے ساتھ بعض لمحاتی کیفیتوں اور شاعرانہ فکر و احساس کے مختلف پہلوؤں کے آئینے میں پرکھنے کا ہُنر رکھتے ہیں وہ اپنے عہد کی ہر بدلتی ہوئی حقیقت کو اس طور پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں کہ موجودہ عہد ہی نہیں بلکہ آنے والے عہد میں بھی ان کی شاعری مشعل راہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کے منفرد طرز فکر اور اظہار کی حسن کاری نے انہیں معتبر تخلیق کار بنا دیا ہے۔

ظریف احمد ظریفؔ لکھتے ہیں:

''رفیق رازؔ اردو اور کشمیری زبان و ادب کے معتبر شاعر، ادیب، نقاد، محقق اور صاحب اسلوب کار کی حیثیت میں ایک مثالی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان کا منفرد لب و لہجہ اور ان کا منفرد طرز فکر، اظہار خیال کی حسن کاری، تخلیقی تجربات تصورات کی بازیابی، معنویت کی تہہ داری

الفاظ کی تازگی اور توانائی نے انہیں معتبر تخلیق کار بنا دیا ہے''۔۴

رفیق راز منفرد اسلوب و آہنگ کے ساتھ ریاستی شعری اُفق پر ابھرے۔ کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں اپنی ذات کی کربناکیوں، بے چینیوں اور زمانے کے بدلتے رجحانات، قدروں کی شکست وریخت اور غیر یقینیت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ سہمے ہوئے سکوت کی چہکار کا ذکر کر کے وہ اپنا ایک اچھوتا اور متنوع شعری منظرنامے کی تخلیق کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شبینہ پروین لکھتی ہیں:

''رفیق رؔاز اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں پہلے وہ فارسی میں لکھتے تھے پھر اُردو کی طرف راغب ہوئے۔ رفیق راز جدید غزل گو ہیں۔ ان کا اندازِ بیان اردو اور کشمیری میں دوسرے شعراء سے بالکل الگ اور منفرد ہے۔ رفیق رؔاز ۱۹۶۰ء سے پہلے ہی لکھ رہے ہیں وہ اپنے ماحول اور ذات کی کربناکیوں سے آگاہ ہیں اور ان کو محسوس کر کے ان کو شعر کا جامہ پہنانے کی مہارت رکھتے ہیں۔ رفیق راز کے یہاں لفظیات کی بہتات ہیں اور تجربات کا عمل رواں دواں ہے۔ ان کی شاعری میں فکر و احساس کی تازگی نمایاں ہے اور تجربات میں تہہ داری پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری پر حسیاتی فضا چھائی ہوئی ہے۔ وہ ایک کامیاب اور منفرد اسلوب کے شاعر کی حیثیت سے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول

کرتے ہیں۔ان کا رجحان زیادہ تر مشکل پسندی کی طرف ہے وہ اپنی شاعری میں پیچیدہ پیکر تراشی اور فارسی تراکیب کا استعمال کرتے ہیں''۔۵

اسی مضمون کی تائید میں مظہر امام یوں لکھتے ہیں:

''کشمیر کے نئے شاعروں میں رفیق راز نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی خلاقانہ قوت اور شعری لطافت کا اظہار کیا ہے۔ان کے تخلیقی جوہر کی جلوہ گری سے اُن کا کشمیری کلام روشن ہے، لیکن اُردو شاعری میں بھی ان کے فکر، اسلوب کی تازہ کاری کے نقوش واضح ہیں۔وہ غالب کی فارسیت آمیز بیان کے دلدادہ ہیں لیکن کبھی کبھی اپنے آپ کو اس طلسم سے آزاد بھی کر لیتے ہیں''۔۶

رفیق رازؔ چند اُن معدودے شعراء میں شمار ہے جنہیں کسی رجحان یا تحریک سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی شعری کائنات میں جدید اسلوب کی نشاندہی ضرور کی جا سکتی ہے۔ ان کے تجربات و احساسات شعری پیکر میں ڈھل کر نت نئی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔عصری زندگی سے واقفیت ان کی شاعری کو زندگی عطا کرتی ہے۔وہ اپنی شعری کائنات کے ساتھ ساتھ اپنے طریقہ اظہار کو الگ ڈھنگ سے پیش کرنے میں مہارت اور ہنر رکھتے ہیں۔ان کے اشعار کا آہنگ بھی انفعالیت اور بے چارگی کے احساس سے بالکل عاری ہے۔ڈاکٹر ریحانہ لکھتی ہیں:

''رفیق راز بنیادی طور پر فعال اور متحرک فکر کے شاعر ہیں۔

ان کی فکر کا سفر کسی خاص نکتے یا مقام پر آ کر نہیں ٹھہرتا بلکہ ذات اور کائنات کی لامحدود وسعتوں میں رواں ہے۔ رفیق رازؔ کو کسی خاص مقصد تحریک اور رجحان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کے لہجے کو کسی مخصوص اسلوب کی توسیع یا تجدید کہا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہیں روایت کا گہرا شعور اور ادراک حاصل ہے اور وہ جگہ جگہ اس سے اکتساب بھی کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رفیق راز نے اپنی شعری کائنات کے ساتھ ساتھ اپنے اظہار کے طریقوں کو خود خلق کیا ہے جس کی توسیع ممکن ہے تتبع نہیں''۔ ۷

رفیق رازؔ اپنے ہمعصر شعراء اس لیے بھی منفرد ہے کہ ان کا ایک اپنا ہی منفرد و مخصوص لب و لہجہ ہے۔ ان کے استعاروں کو برتنے کا سلیقہ بالکل ہی جدا ہے۔ ان کے انداز بیان میں کافی لوچ اور لچک موجود ہے اور فکر میں وسعت و گہرائی ہے یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ان کے کلام میں پیچیدہ پیکر تراشی اور فارسی تراکیب کے غالب استعمال نے انہیں مشکل پسند بنا دیا ہے۔ رفیق رازؔ کی لفظیات کا دائرہ وسیع ہے الفاظ کا استعمال اُن کی شاعری میں نئے تلازمات پیدا کرتا ہے۔ ان کی شاعری متضاد علامتی پیکروں کا اجتماع ہے اور تجربات کی تہہ داری ان کی غزلوں کو معنویت عطا کرتی ہے۔ اس ضمن میں ممتاز نقاد حامدی کاشمیری یوں رقمطراز ہیں:

''رفیق راز لفظ کے اداشناس ہیں وہ لفظوں کے تخلیقی برتاؤ کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی فہم و ذکاوت، شائستگی اور ریاضت سے کام لیتے ہیں اور ان لفظوں کے انسلاکات اور

ممکنات کوراہ دیتے ہیں۔اس طرح وہ تجربے کے متنوع
مظاہر کی جلوہ گری کا سامان کرتے ہیں اور قاری کوخوشگوار
حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔رفیق رازؔ کو بلاشبہ نئی نسل کے
اُن شعراء میں کیا جاسکتا ہے جوآزادی فکراور طلب وجستجو کواپنا
شعار بناتے ہیں اور یہ کام صنف غزل کے مسلمہ لوازم وآداب
کی پاسداری کرتے ہوئے بھی انجام دینے کی سعی کرتے
ہیں۔نتیجتاً ان کی آواز صدائے بازگشت ہوکر یا گم ہوکرنہیں رہ
جاتی بلکہ اپنے منفرد ہونے کا گہرا تاثر پیدا کرتی ہے۔یہ آواز
مقامی تہذیبی نور ونغمہ سے بروضد ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔
اہم بات یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں یہ غزل کا لسانی برتاؤ
ہے، جو رفیق رازؔ کی شعری حسّیت کی تشکیل کرتا ہے''۔۸

رفیق راز نے اُردو غزل میں خاص طور پر اپنی انفرادیت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی نئی نئی وادیوں کی سیر کرواتے نظر آرہے ہیں۔وہ اپنے موضوعات گردوپیش کے ماحول اور محرکات سے تلاش کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں متنوع موضوعات ملتے ہیں اور وسعت وہمہ گیری فنی وفکری اور لسانی اعتبار سے دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ اپنے اشعار کو نئے اور دلکش عروضی سانچوں میں ڈھال کر الفاظ وتراکیب اور استعاروں کو نئے نئے مفاہیم ومعنی سے ہمکنار بھی کرتے ہیں۔ان کی شاعری یک رخی نہیں بلکہ ہمہ رخی اور تہہ دار ہے۔رفیق کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی یوں رقمطراز ہیں:

''رفیق رازؔ کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی درکار ہے۔ بعض لوگوں نے غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے۔ بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق رازؔ اُن شعراء میں نمایاں ہیں جنہوں نے غزل کی اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہیں۔رفیق راز کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں۔ گردوپیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس محاربہ رفیق راز کی غزل کا خاص موجوع ہے ان کے شعراء کا آہنگ انفعالیت اور بے چارگی کے احساس سے بالکل عاری ہے۔زبان کے ساتھ بھی ان کا رویہ غیر رسمی اور تخلیقی ہے''۔۹

نمونۂ کلام

لوگ مجھ کو دیکھ کر اتنے ہیں کیوں حیران سے
جیسے ناقہ پر میں آیا ہوں ابھی کنعان سے

آنکھوں سے بہتے ہوئے دریاؤں پر مت دھیان دو
روح کے صحرا میں دیکھ دھوپ کتنی تیز ہے

گزر آیا ہوں کچھ راتیں درونِ غار میں بھی
نکل آیا ہوں سورج سا سرِ کہسار میں بھی

جسم کے دشت میں ویرانی جاں بولتی ہے
فرق یہ ہے کہ کوئی اور زباں بولتی ہے

گونج سکتی ہے کسی وقت فنا کی جھنکار
سنگ سے کار گہہِ شیشہ گراں دور نہیں

ہمارے خون کی خوشبو کہ جاگ اٹھے گی
معطر اس سے یہ اکیسویں صدی ہوگی

گلے پہ خاک تمہارے سر اور تال پہ خاک
غزل یہ خاک مضامین پائمال پہ خاک

ہے میری غزل سرو چراغان مضامین

دیواں ہے مرا گرمئی اظہار سے روشن

کہاں سے آتے ہی لعل و گہر خیال کے ہر روز
دبا ہوا تو نہیں میری خاک ہی میں بدخشاں

آیا ہوں لوٹ کے میں ابھی دشت خواب سے
ڈرنے لگے ہیں لوگ مری آب و تاب سے

عشق اگر ہے دین تو پھر ہو جائیں گے
ہم بھی مرتد اس کے مکمل ہونے تک

تیری غزل پڑھی تو یہ جانا رفیق رازؔ
پانی کے شعور میں ہے روانی کا شعور بھی

ایاز رسول نازکی بھی شفق سوپوری کے اہم معاصرین شعراء میں شمار ہیں۔ایاز رسول نازکی ۲۵ رمئی ۱۹۵۱ء میں جموں میں مرزا غلام رسول نازکی کے گھر پیدا ہوئے۔آپ بڑے ذہین ہیں اور اپنی ذہانت کی بدولت اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد درس وتدریس کے کام میں لگ گئے۔ چنانچہ انہیں کم عمری سے ہی ادبی ذوق ودیعت ہوا ہے اور اسی ادبی ذوق وشوق کی بدولت شعری ونثری تخلیقات سے اردو کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ایاز رسول نازکی نے کم وبیش چار

پانچ کتابیں لکھی ہیں جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) خودرو (شعری مجموعہ ۲۰۰۰ء)

(۲) شام سے پہلے (شعری مجموعہ ۲۰۰۸ء)

(۳) مقامِ راست (کشمیری شعری مجموعہ)

(۴) Echo (انگریزی)

ایاز رسول نازکی جدید نسل کے شاعروں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان میں بھی اپنے تخلیقی صلاحیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ اردو زبان کے شاعر ہیں اور اردو زبان میں ہی ان کا رنگ سخن پوری طرح واضع اور پُراثر دکھائی دیتا ہے۔ ایاز رسول نازکی کے کلام کو پڑھ کر یہ بات صاف طور سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے کلام میں جابجا عشق کے جذبات فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ ان کے چند اشعار میں اس بات کی طرف بھی واضع اشارے ملتے ہیں کہ ان کا محبوب ارضی محبوب ہے اور اسی زمین سے تعلق رکھتا ہے۔ ایاز رسول نازکی غزل کے تمام تر لوازامات سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنی شاعری میں خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت کا بھی فنکارانہ اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری ذہانت اور مطالعے کی آئینہ دار ہے۔ ایاز رسول نازکی نے اپنے شاعری کے ذریعے اپنے عصر کی عکاسی کی ہے وہ اپنے دور کی سماجی ناانصافی، استحصال اور اخلاقی بے معنویت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔

ایاز رسول نازکی نئی غزل کے شاعر ہیں اور نئی غزل موجودہ دور کے بحران کی تجسیم کاری کے لیے لفظ و پیکر کے علامتی امکانات کو بروئے کار لاتی ہے اور نازکی صاحب نہ صرف موجودہ بحرانی صورتحال کا احساس رکھتے ہیں بلکہ وہ الفاظ کے ایمائی امکانات کی کھوج لگانے کی

ضرورت کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ان کے کلام میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن سے بے تکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایاز رسول نازکی مرزا غالبؔ سے متاثر ہیں۔ایاز رسول نازکی اپنا ایک منفرد اسلوب اور لہجہ اور آہنگ رکھتے ہیں۔ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں ماحول اور روایت سے جو مواد ملتا ہے اس کو تخلیقی عمل کے ذریعے تحلیل کر کے اپنے نادر اور اچھوتے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ایاز رسول نازکی کے حوالے سے ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے کلام میں عشق کے جذبات کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے بلکہ عشقیہ جذبات کے ساتھ ہی ساتھ محسوسات و مشاہدات اور تصورات الفاظ کے سانچوں میں ڈال کر نہایت حسین اور فطری انداز میں ملتے ہیں۔اور علاوہ ازیں ان کے کلام میں سیاسی، سماجی، معاشرتی اور عصری شعور کی آگہی اور فنی دروسیت کی پختگی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ان تمام خصوصیات کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے ؎

ہم نہ مومن ہیں، ہم نہ کافر ہیں
کلمہ گو ہیں عبادتوں کے بغیر

ہم کو بچھڑے کتنے گزرے سال بتادوں اے کشمیر
تیرے سولہ، میرے سولہ ہوتے ہیں بتیس برس

عشق میں ہم نے سر نہیں دیکھا
اُن پہ پھر بھی اثر نہیں دیکھا

عشق میں کوئی ہمسری کرتا
ہم کو الزام سے بری کرتا

ہجر تھا یا وصال کس کا تھا
خواب تھا یا خیال کس کا تھا

متذکرہ بالا اشعار اس بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں کہ ایاز رسول نازکی صاحب کی غزلوں میں خوابوں اور حقیقتوں کا ٹکراؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ شاعر نہ صرف زمینی حقائق کی بھرپور آگہی رکھتا ہے بلکہ پورے آب وتاب کے ساتھ اپنے کلام میں تصورات و احساسات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ممتاز نقاد جاوید انور ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''وادی کشمیر کے منظر قدرت کو علامتوں میں ڈھال کر معاشرتی مسائل کا شدت سے اظہار ان کی اپنی زمین کے دکھ درد کا آئینہ دار ہے۔ اس کے آگے غور کریں اور وادی کے کچھ ناموں کو علیحدہ کریں تو دونوں دن اپنا دامن دراز کرتی ہوئی مفلسی، ناکامی، محرومی، غلامی اور شکست کا تصور بہت عام ہے۔ ایاز صاحب نے سماجی اور ماحولیاتی کشمکش کے درمیان زندگی کے آہستہ لیکن اس تغیر کو شدت سے محسوس کیا ہے جو آگے چل کر انقلابی تغیرات کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے..... ایاز رسول نازکی صاحب سماج کی بعض

تفریحات کو تسلیم کرتے ہوئے بعض بنیادی باتوں پر اتحاد کی
راہیں بھی تلاش کرتے ہیں جو میرے خیال میں اعلیٰ شعری
مزاج کا ایک خاص وصف ہوتا ہے۔ علامت نگاری اور مشرقی
فلسفے سے واقفیت نے ان کے شعری کرداروں کو متنوع
موضوعات سے ملا کر شعر کے منصب کو عروج تک لے جانے
میں اہم کردار ادا کیا ہے''۔ ۱۰

شفق سوپوری کے معاصر شعراء میں ''خالد بشیر'' کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کا نام بشیر احمد اور خالد تخلص کرتے ہیں۔ ۲۰ فروری ۱۹۵۴ء میں سونہ وار سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی مضافاتی علاقے میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم یونیورسٹی آف کشمیر سے حاصل کی جہاں سے آپ کو ایم اے کی ڈگری تفویض ہوئی۔ خالد بشیر فی الوقت ادبی خدمات میں مشغول ہیں اور ان کی تخلیق کردہ کتابوں کو اعزاز بھی عطا ہوئے اور پذیرائی بھی ہو رہی ہے۔ ''صدائے نیم شب'' ان کا شعری مجموعہ ہے جس پر انہیں ۱۹۸۳ء میں بہترین کتاب ایوارڈ کا اعزاز نصیب ہوا ہے۔ اس کتاب ''صدائے نیم شب'' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مظہر امام یوں لکھتے ہیں:

''خالد بشیر کا ایک شعری مجموعہ جس میں اُن کا صرف ڈھائی
سال کا کلام شامل تھا، ''صدائے نیم شب'' کے نام سے شائع
ہو چکا ہے۔ ان کے مجموعے کا ایک سرسری مطالعہ زبان و بیان
کے کچے پن کا احساس دلاتا ہے لیکن کچے پھلوں کا بھی اپنا ایک
ذائقہ ہوتا ہے۔ ان کی بصری پیکر تراشی اکثر تصورات کی نئی

کر ہیں کھولتی ہیں.....''درخت اور پرندہ'' خالد بشیر کے
مانوس استعارے ہیں۔وہ شناسا لہجے اور متوازن اسلوب کے
شاعر ہیں''۔۱۱

خالد بشیر وادی کشمیر کے جدید نسل کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔جو وادی کے شعری دامن کو نت نئے گل بوٹوں سے سجانے کا ہُنر بخوبی جانتے ہیں اور اس ہُنر کا استعمال بھی بخوبی کر رہے ہیں۔خالد بشیر صاحب کی شاعری میں جدید اسلوب کی نمائندگی نظر آتی ہے اور ان کے تجربات و احساسات شعری پیکر میں ڈھل کر نت نئی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔عصری زندگی سے بھرپور واقفیت ان کی شاعری کو زندگی عطا کرتی ہے۔خالد بشیر احمد کے کلام میں خوابوں کے دنیا کی سجاوٹ ہے لیکن حقیقی دنیا کی کشمکش سے بالکل نا آشنا بھی نہیں ہیں۔

خالد بشیر صاحب کی شاعری میں روحانی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔خاص طور سے ان کی غزلوں میں کلاسکیت بھی ہے اور اپنے عہد کے اسالیب و مسائل بھی ہیں۔پُر آشوب سماجی زندگی،ظلم و بربریت اور انسانی رشتوں کی پامالی کے اظہار کو وہ نہایت صدق دلی سے اپنے شعری کینواس پر اتارنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔عصری انتشار اُن کے شعری ذہن کو غزا فراہم کرتا ہے۔اُن کے کلام میں جگہ جگہ نئے تصورات کی نشاندہی ہوتی ہے۔غزلوں کے علاوہ نعت گوئی میں بھی اپنے کمال فن کا اظہار کر رہے ہیں۔ان کے بیشتر اشعار زندگی کی اُن حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں جس میں زیارہ تر تعلیق انسانی فطرت میں قدرت کی جانب سے ودیعت کردہ اُن فصات سے ہے جو کافی حد تک حلم و کرم اور اس کے نتیجے میں اظہار تشکر سے نمایاں ہوتی ہیں۔اس کا اندازہ اُن کے حمد و نعت کے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔متذکرہ بالا خصوصیات کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے ؎

سفر کٹھن ہے میرا رہنما ہے میرے ساتھ
کہ دشتِ خار میں ماں کی دعا ہے میرے ساتھ

یون نہ تھا جور و جفا تیری طرف سے پہلے
کتنا معصوم تھا تو ایسے شغف سے پہلے

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی

ذرا سی دیر میں پانسہ پلٹ بھی سکتا ہے
جو اپنی بات پر قائم ہے، ہٹ بھی سکتا ہے

خالد بشیر کی شعری کائنات پر تبصرہ کرتے ہوئے جاوید انور یوں لکھتے ہیں:

''خالد بشیر نے اپنے اشعار میں زندگی کے اُن حقیقتوں کا اظہار کیا ہے جن میں انسانی صفات کے حلم و کرم کے نتیجہ میں اظہار تشکر نمایاں ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں جن حالات اور زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں اس میں غم، اداسی، کرب اور مایوسی کے ساتھ ساتھ امید و آرزؤں کا انسلاک بھی شامل ہے۔ وہ اپنے کلام میں جہاں ذات و کائنات کے ازلی مسائل کو سامنے لاتے ہیں وہیں اپنے مخصوص سماج کے ذہنی و جذباتی

ماحول اور حالات وواقعات کو بھی پیش کرتی ہے۔ وہ اپنے
جذبہ وفکر کے اظہار کے لیے تخلیقی اور تہذیبی روایت کے طویل
سلسلوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے عہد کی حقیقتوں
میں اظہار کی نئی صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے تخلیق اور
تہذیبی روایت کے طویل سلسلوں کے جستہ جستہ عناصر بھی
واضح اور کبھی مبہم شکلوں میں ان کی شاعری میں در آئے ہیں۔
خالد بشیر کا یہ تمام ادراک اور طرز احساس انہیں شعر وادب
میں نمایاں مقام کا حامل بناتا ہے''۔ ۱۲

ڈاکٹر شفق سوپوری نے کشمیر میں اردو شعر وادب کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے اور خاص طور پر کشمیر کے اردو غزل پر جب بھی قلم اٹھایا ہے تو خالد بشیر کی غزلیہ شاعری کا حوالہ لازمی طور پر دیا ہے۔ خالد بشیرؔ کے شعری مجموعہ ''صدائے نیم شب'' اور ''خواب پارہ'' پر کئی نقادوں نے اپنی اپنی نظر سے دیکھا ہے لیکن شفق سوپوری نے اپنے ایک مضمون ''خالد بشیر صدائے نیم شب اور خواب کا شاعر'' کے عنوان سے خالد بشیر کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''خالد بشیر ایک صاف اور ستھرے اسلوب کے شاعر ہیں۔ اُن
کا کلام زولیدہ بیانی اور ابہام سے اپنا دامن بچا کر شاعر اور
قاری کے درمیان ایک ایسے مکالمے کی صورت اختیار کرتا ہے
جہاں مخاطب کی ذات مخاطب میں گُم ہو جاتی ہے۔ خالد بشیر کی
شاعری کا مطالعہ کر کے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ ان کی

شاعرانہ شخصیت مزاج اور افتادِ طبع نیز تجرباب ومحسوسات حقیقی ہیں ان کی فکر کی جڑیں زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہوکر انسان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ شاعری کی تخلیقی شرائط کو پورا کرنے کی کوشش میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ اُن کے استعمال کئے ہوئے الفاظ، استعارے اور علامتیں زندگی کی حقیقتوں سے آب و تاب لے کر اپنے فکری آہنگ کو اس میں امیز کر کے معاملات زیست پر شاعرانہ اور دانشورانہ تبصرہ کرتے ہیں۔ گذشتہ دہائیوں سے جن حالات سے اہل کشمیر دوچار ہیں ان کی المناکی سے ہر حساس اور دردمند شاعر متاثر ہوا ہے اور ریاست جموں وکشمیر کے تقریباً ہر شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے عصر کے درد وکرب کا تذکرہ کیا ہے۔ عصری حسیت کے تعلق سے خالد بشیر اس وجہ سے بھی زیادہ بیدار ہیں کیونکہ انہوں نے کشمیر کی المناک سیاسی تاریخ کے دردناک ابواب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے لہٰذا ان کے کلام میں جگہ جگہ پر اہل کشمیر کی حرماں نصیبی کا ذکر مختلف پیرایوں میں ملتا ہے۔ خالد بشیر کے یہاں اپنے دوسرے ہمعصر شعراء کے علی الرغم زندگی میں عشق کی فضیلت، مرکزیت اور اولیت کا ایک مقدس جذبہ نظر آتا ہے ان کا جذبۂ عشق میر تقی کی خودسپردگی کی حدوں کو

چھوتا نظر آتا ہے۔ آخر پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خالد بشیر انسانی حیات اور اس کے ماحول کے رشتوں کو بالکل انوکھے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی غزل میں داخلیت اور خارجیت کی تمام سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں وہ سب کیفیتیں ہیں جن سے آج کے بدنصیب شاعر کو دو چار ہونا پڑتا ہے''۔ ۱۳

نمونۂ کلام ؎

میرا مزاج وہی نرم خو ہے پہلے سا
وہ تیری بات میں ہی انتقال ایسا تھا

وفا کا دور ہے جب سے زوال آمادہ
یہ دل ہوا ہے زیادہ وصال آمادہ

اسی امید پہ دل کا سکون لٹا جاتا ہے
عتاب شب کا مدار نئی سحر میں ہے

جدائیوں کا یہ موسم بھی اپنی قسمت ہے
رفاقتوں کے زمانے نصیب تھے وہ بھی

یہی تھی فکر چھپالیں دریدہ دامن کو
ہم ایسے وقت ستارے شمار کرتے ہیں

کہانی کار! میرے شہر کے حوالے سے
نظر اٹھاتے شفق منظروں سے آگے بھی

ایک جگنو کی چمک باقی تھی وہ بھی کھو گئی
دور تک پھر جنگلوں میں راستہ کوئی نہ تھا

کس قدم میں ہے حلقۂ زنجیر میں ہوا
خوشبوؤں پر عتاب کیوں ہر رہگذار میں ہے

فصیل شہر پر سہرا رہا تھا امن کا پرچم
درون شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

ڈاکٹر نذیر آزاد شفق سوپوری کے ہمعصر شاعر بھی ہیں اور قریبی دوست بھی۔ ڈاکٹر نذیر آزاد وادی کشمیر کے نئے نسل کے شعراء اپنی ایک الگ اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ آپ کا نام نذیر احمد اور نذیر آزاد قلمی نام ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۸ / جون ۱۹۸۵ء میں کشمیر کے پلوامہ ضلع میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالرحمان آزاد ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی

مضافاتی علاقے میں مکمل کی اور آپ نے تعلیمی میدان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ تعلیم مکمل ہونے پر محکمۂ تعلیم میں ایک معلم کے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں اور تاحال اسی محکمۂ سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر نذیر آزاد چنانچہ کم عمری سے ہی شعروشاعری کررہے ہیں اور ادبی ذوق وشوق کی بنا پر اب تک ان کی مندرجہ ذیل شعری تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۱) نغمۂ زنجیر

(۲) سبوچہ

ڈاکٹر نذیر آزاد کشمیر کے قادرالکلام شعراء میں اپنا نام پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی اظہار ذات کے لیے اردو کے ہر دلعزیز صنف غزل کا سہارا لیتے ہیں۔ غزل سے انہیں فطری لگاؤ ہے اور روایتی ڈگر ہی پر چل کر وہ غزل میں نت نئے اسالیب کو سمونے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اس عظیم اور بلند مرتبہ شاعر کے ضمن میں پروفیسر بشیر احمد نحوی یوں رقمطراز ہیں:

> ''ڈاکٹر نذیر آزاد شعروادب کے میدان میں اپنی بالیدہ فکر حسن نظر اور قوتِ اثر کے ساتھ اپنا ایک منفرد مقام پیدا کرنے میں سعی مسلسل کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ جس تیز رفتاری کے ساتھ وہ شہر کی راہوں پر چلتے نظر آتے ہیں اسی انداز میں ان کا آشیب فکر ونظر آگے کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔ غزلیات، منظومات آزاد ایک مخصوص لہجے اور ایک ممتاز شعری اسلوب کی عکاسی کرتی ہوئی شاعر کے جنسی، بصری اور

مشاہداتی تازہ کاری کا پتہ دیتی ہے۔اردو زبان وادب کو آزاد
سے بڑی توقعات ہیں گذشتہ پچیس برسوں سے ڈاکٹر آزاد
صاحب اردو تدریس وتحقیق کے ساتھ جس ثابت قدمی سے
وابستہ ہیں وہ ان کے شاندار اور حوصلہ افزاء مستقبل کی غمازی
کرتی ہے''۔ ۱۴

ڈاکٹر نذیر آزاد کے بارے میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ وہ کشمیر کے جدید نسل کے شعراء میں اہم مقام پر اپنا نام بنا چکے ہیں۔وہ غزل کے ممتاز شاعر ہے ہی نظم نگاری میں بھی ایک الگ اسلوب اور لب ولہجہ کے ساتھ تخلیقی میدان میں رواں دواں ہیں۔لیکن حقیقت میں ان کا رنگ سُخن اور فنی چابکدستی صنف غزل میں نمایاں ہے۔ڈاکٹر نذیر آزاد کشمیر کی سیاسی بدحالی اور بے اعتنائی سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور یہی واقفیت ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ عام طور سے کشمیر کے نئے نسل کے شعراء کے کلام میں محرومی، بے چارگی اور تنہائی کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔اس نئی نسل کے شعراء پر اظہار خیال کرتے ہوئے کشمیر کے ممتاز نقاد حامدی کاشمیری یوں لکھتے ہیں:

''کشمیر کے نئے شعراء کے کلام میں محرومی، فریب، شکستگی اور
بیچارگی کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔وہ روایتی سطح پر
استحصالی قوتوں کے جمہوریت، آزادی، قومی تشخص اور عزت
نفس کے اقدار کی بیخ کنی پر نالاں ہیں اور کبھی کبھی ان کے
لہجے میں اضطراب تلخی، نفرت اور بغاوت کی شعلگی کا احساس
ہوتا ہے''۔ ۱۵

ڈاکٹر نذیر آزاد کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو بعض اشعار عصری شعور کی عکاسی کرتے ہیں اور کلام میں جگہ جگہ عصری شعور کے ساتھ ساتھ نئے تصورات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ان کے یہاں یاسیت، افسردگی وطن اور انسانیت کی خدمت کے لیے سرفروشانہ جذبات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے اشعار متضاد علامتی پیکروں کا اجتماع ہے اور تجربات کی تہہ داری ان کی غزلوں کو معنویت عطا کرتی ہے۔

وادیاں کہسار جھیلیں راستے تھے در شمار
ملک جاناں کے مگر سب گوشوارے کھو گئے

ہوگئیں پلکوں سے ہی رخصت وہ موجیں خواب کی
ڈیرا ڈالے ہے یہاں آنکھوں کے اندر تشنگی

ڈاکٹر نذیر آزاد کے کلام میں گہرائی اور گیرائی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ان کی غزلوں میں تاثر کی شدت اور وحدت نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔سادگی و پرکاری، کیف واثر، شائستگی، متوازی، صالح احساس، دلوں پر آہستہ آہستہ اثر کرنے والی کیفیت، ضبط محبت، خودداری، داخلیت وخارجیت، جیتا جاگتا محبوب، زندگی کے مسائل ومطالبات کا اظہار فنی چابکدستی کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ڈاکٹر نذیر آزاد کی شاعری خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمان فاروقی یوں لکھتے ہیں:

''نذیر آزاد کی دو صفتیں ان کے کلام کو ممتاز کرتی ہیں ایک تو یہ کہ وہ مضمون کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہ تلاش ان کے یہاں دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔وہ نئی بات ڈھونڈتے

رہتے ہیں اور پرانی باتوں کو نئے ڈھنگ سے دیکھنے کے لیے
کوشاں رہتے ہیں۔ دوسری صفت ان کی یہ ہے کہ وہ اپنے اور
اپنی وادی پر، اپنے اہل وطن پر گزرنے والی واردات کو کسی
اخباری خبر یا سیاسی تبصرے کی طرح نہیں بلکہ شعر کے روپ
میں بیان کرتے ہیں۔ نذیر آزاد نے نظموں میں نسبتاً زیادہ
واضح اسلوب اختیار کیا ہے اور ان میں ان کا ذاتی کرب اور
کشمیر کا کرب یکجا ہو کر کچھ آفاقی سا رنگ اختیار کر گئے
ہیں لیکن نذیر آزاد کی قوت اختراع کے جوہر ان کی
غزلوں میں کھلتے ہیں جہاں نئے ردیف وقوافی سے لے کر
نئے الفاظ اپنی جلوہ گری دکھاتے ہیں''۔ ۱۶

ڈاکٹر نذیر آزاد کی شاعری حقیقی رنگ اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ موجودہ عہد کی بدلتی صورت حال کی منظر کشی شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد صاحب کے اشعار میں ان کے تجربات اور محسوسات کی نوعیت بیشتر حقیقت پر مبنی ہے ان کے اشعار بنیادی طور پر شعری عقدہ حسن، صداقت اور خیر کی جستجو میں مضمر ہے۔ وہ ہنگامی یا وقتی ضرورت کے تحت اشعار کہنے سے گریز کرتے نظر آرہے ہیں۔ وہ زندگی زمانہ اور فطرت کے ناحیاتی تسلسل سے منسلک ہو کر اپنے کلی وجود کی ہمہ گیریت کو سامنے لاتے ہیں۔ بحر کیف ان کے یہاں شاعری کا ذخیرہ الفاظ قدیم اور مروجہ شعری روایت سے لیا ہے۔ ان کی شعری خصوصیات پر ڈاکٹر شفق سوپوری یوں رقمطراز ہیں:

''نذیر آزاد ریاست جموں وکشمیر کے اُردو شعراء میں ایک

ممتاز مقام رکھتے ہیں۔اردو ادب کے اعلیٰ حلقوں میں ان کی بڑھتی ہوئی شہرت اور مقبولیت اس بات کی غماز ہے کہ ان کا کلام سنجیدگی سے پڑھا جارہا ہے۔نذیر آزاد کی شاعری دور حاضر کی المناکیوں کا ایک استعاراتی اظہار ہے۔وہ لفظ پیکر، استعارہ اور علامت کے برتاؤ پر فنکارانہ دستگاہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شاعرانہ اسلوب حقائق سے قریبی رشتہ استوار کر کے قاری پر جذب و استغراق کی کیفیت طاری کرتا ہے۔نذیر آزاد اُردو غزل کی روایت سے روشنی لے کر فکر و خیال کے ایسے چراغ منور کرتے ہیں جو دور دور تک ضیا پاشی کرتے ہیں۔ان جلوہ گاہوں میں نذیر آزاد کی ذات اور کائنات کا آئینہ خانہ نظر آتا ہے''۔۱۷

نمونۂ کلام

ہم حفاظت سے زرِ دیدۂ تر رکھتے ہیں
اور صرفے کو دل و جان و جگر رکھتے ہیں

میں نے سوچا تھا کہ وہ موجۂ عنبر ہوگا
کیا خبر تھی کہ کوئی دستِ ستمگر ہوگا

ابھی تعمیر کے حالات کہاں جنگل میں

آگ باقی نہیں پھر بھی ہے دھواں جنگل میں

نتیجہ صبح پر چھوڑا تھا میں نے
کہ بستر تھا، شراتھے اور میں تھا

ہمیں نے اُس کو سمندر کی سمت بھیجا تھا
ہماری طرح بشر ہے پھسل گیا ہوگا

چاند جگنو روشنی کرنیں سرارے کھو گئے
حسنِ مستغنی کے آگے استعارے کھو گئے

میں تو پتھر ہوں ہواؤں سے بھی لڑ سکتا ہوں
تیرے گیسو تو نہیں ہوں کہ بکھر جاؤں گا

شکر خوابی سے بالآخر مجھے بیدار ہونا تھا
کہ اپنی ذات سے اِک دن مجھے دوچار ہونا تھا

رخسانہ جبین بھی ڈاکٹر شفق سوپوری کے اہم معاصرین میں شمار ہوتی ہیں۔رخسانہ نام اور رخسانہ جبین قلمی نام رکھتی ہیں۔آپ کی پیدائش یکم مئی ۱۹۵۵ء میں خواجہ بازار سرینگر میں ہوئی۔آپ کے والد صاحب غلام نبی شاہ سرکاری ملازم ہیں۔رخسانہ جبین صاحبہ کی تعلیمی

قابلیت ایم اے، ایم فل ہے اور ریڈیو کشمیر سرینگر سے وابستہ ہیں۔آپ نے کم عمری سے شعرو شاعری کا شغف اپنایا اور لگ بھگ ۱۹۷۷ء ہی میں یونیورسٹی آف کشمیر میں تعلیم کے دوران ہی بحیثیت شاعرہ مشہور ہوگئی۔آپ کے ابتدائی کلام پر مخمور سعیدی، شہریار اور بلراج کومل کے اثرات ضرور دیکھے جاسکتے ہیں اور پھر تجربے نے انہیں جدید شاعروں کا گرویدہ بنادیا۔

وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والی شاعرات میں رخسانہ جبین کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ اردو ادب اور خاص طور سے اردو شاعری میں اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔وہ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے سے اُردو ادب کو اپنی شاعری سے مالا مال کر رہی ہیں۔وہ جداگانہ لب ولہجہ کی شاعرہ ہیں اور بہت حد تک ایک متانت آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔نیا پن ان کی شاعری کا خاصہ اُردو کے اہم ادبی رسائل وجرائد میں ان کا کلام برابر شائع ہو رہا ہے۔اور مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔اب تک اگرچہ اُن کا کوئی بھی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے لیکن امید ہے بہت جلد اُن کا شعری مجموعہ منظر عام پر آکر اردو کے معیاری شعروادب میں اضافہ کرے گا۔

رخسانہ جبین جدید غزل گو شاعرہ ہیں اور آپ کو نہ صرف اردو زبان پر کامل دسترس ہیں بلکہ فارسی زبان کا بھی زبردست مطالعہ رکھتی ہیں۔فارسی کے اس گہرے مطالعے کی وجہ سے ان کے اردو کلام میں فارسیت کا غلبہ ہے۔ان کلام پر جہاں برصغیر کے نمائندہ شاعروں کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔وہی ان کا کلام ایرانی شاعرات سے متاثر نظر آتا ہے۔اس حوالے سے مظہر امام لکھتے ہیں:

> ''رخسانہ جبین کشمیر کی شاعرات میں بہت تیزی سے
> نمایاں ہوئیں۔جدید فارسی ادب کے مطالعے نے ان کے

شعری ذوق کی آبیاری کی ہے۔ان کے اشعار میں تخلیقی جوہر
کی چنگاریاں لودیتی محسوس ہوتی ہیں۔ان کے اظہار میں ایک
جدت اوراسلوب میں ایک بے ساختگی ہے۔مشہورایرانی
شاعراہ فروغ فرخ زار کی بیباکی اور جسارت کی جھلکیاں
رخسانہ جبین کے کلام میں بھی مل جاتی ہیں''۔۱۸

رخسانہ جبین نے اگرچہ صنف نظم وغزل دونوں کو سینے سے لگایا مگران کی طبیعت میں غزل ہی رچی بسی ہے۔اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شبینہ پروین رقمطراز ہیں:

''کشمیر کے جدید شعراء میں رخسانہ جبین ایک اہم مقام کی
طرف گامزن ہورہی ہے۔ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ
واضح ہوجاتا ہے کہ کشمیر کی نوجوان خواتین اپنی شناخت قائم
رکھنے میں کسی حدتک کامیاب ہوگئی ہے۔شروع شروع
میں رخسانہ جبین تنہائی پسند تھی جس کا اظہار انہوں نے شاعری
میں بھی کیا ہے۔وہ نظمیں بھی لکھتی ہیں لیکن ان کی انفرادیت
غزل میں ہی جھلکتی ہے''۔۱۹

رخسانہ جبین کے شعروں میں استعارات تشبیہات اور تلمیحات کا برمحل استعمال کے ساتھ گہری معنویت پائی جاتی ہے۔قاری اُن کی شاعری میں شگفتگی، روانی اور سحر آفرینی کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔رخسانہ جبین فطری طور پر غزل کی شاعرہ ہیں اور قافیہ بند شاعری ہی میں زیادہ تر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتی ہیں۔اُن کی ہر غزل میں نغمگی اور ترنم موجود رہتا ہے۔ان کے کلام میں حمد ونعت کے اشعار کی کمی نہیں ہے اور چنانچہ مذہبی

جذبات اور عقیدت کی نشاندہی ان کے بعض اشعار میں ضرور کی جاسکتی ہے۔اُن کے اشعار دیگر خصوصیات کے علاوہ حقیقی محبوب کی ثنا خوانی کی مثال ہے۔ان استعار میں ذات واحد کی بارگاہ میں تشکر کا نذرانہ ملتا ہے۔ان تمام خوبیوں کا اندازہ مندرجہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

ثنا وحمد ادا کس طرح ہو لفظوں میں
میرے خدا نے مجھے ظرف سے زیادہ دیا

عطا کرے گا وہ منزل بھی جس نے جادہ دیا
عمل بھی دے گا وہی جس نے ہے ارادہ دیا

جبین گل پہ وہ تصویر اُبھر نہیں پاتی
تو لوحِ سنگ پہ اک منظر فنا ہی لکھ

رخسانہ جبین کے کلام میں سیاسی اور سماجی ابتری کے خدوخال بھی واضح انداز میں ملتے ہیں۔چونکہ کشمیر کی سرزمین سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شاعر اس بدعنوانی سے منہ نہیں موڑ سکتا کہ کشمیر کئی دہائیوں سے سیاسی دلدل میں گرفتار ہے۔ان چیزوں کی عکاس ہر حساس دل شاعر کے کلام میں ملتی ہے۔اس طرح رخسانہ جبین صاحبہ کے کلام میں بھی سماج کی بدحالی اور بدلتے حالات، درندگی کا برمحل اظہار ملتا ہے۔وہ ہر بدلتی حقیقت کو اس طور پیکر میں ڈھال کر پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ہر قاری آپ بیتی سمجھنے لگتا ہے۔جہاں ان کے کلام میں حقیقی رنگ جھلکتا ہے وہی کماحقہٗ روایت کی شاعری کے اسلوب سے الگ راہ نکالنے میں منہمک ہیں۔بقول ڈاکٹر شبینہ پروین:

''رخسانہ جبین کے استعار میں ایک منفرد تخلیقی فضا بھی محسوس
ہوتی ہے۔رخسانہ جبین کے ہاں موضوعات اور اسلوب دونوں
میں روایت پسندی بہت کم پائی جاتی ہے''۔۲۰

رخسانہ جبین کے نزدیک غزل ایک نازک اور لطیف ترین صنف سخن ہے جو گائگی کا تقاضا کرتی ہیں۔ان کے بہت سے اشعار ضرب المثل اور تہہ داری کا درجہ رکھتے ہیں۔ جہاں ان کے بعض اشعار میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے بھولے پن کی طرف اشارے کرتی ہیں وہی وہ وقت، حالات اور سماج کی بھیانک صورت حال کو ایک خاموش تماشائی کی طرح نہیں دیکھتی بلکہ ایک حساس اور دردمند شاعرہ کی حیثیت سے اپنا ایک اصلاحی نقطہ نظر بھی واضح کرتی ہیں۔اس کارخانہ قدرت کو بغور دیکھتی ہیں اور اس میں اپنی ذات کی شناخت، حیثیت اور اپنے مقام و مرتبے کو کھوجنے لگتی ہیں۔کہیں کہیں یہ وہ احساس کمتری اور کم مائیگی کا بھی اظہار کرتی ہیں۔وہ عہد گذشتہ کی صحت مند روایات اور اپنے اسلاف کی عظمت کا احساس رکھتے ہوئے جب موجودہ بحرانی ماحول و معاشرے پر نظر دوڑاتی ہیں تو انہیں گھٹن سی محسوس ہونے لگتی ہے کیونکہ اُن کے معاشرے میں جہاں سیاست اپنا سنگدلانہ کھیل کھیل رہی ہے تو وہیں اور کئی طرح کی ناخوشگواریاں اُن کا خیر مقدم کرتی ہیں۔تب رخسانہ جبین کے جذبات شدت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ اپنے جذباتی ردعمل کو اس طرح کے اشعار میں ظاہر کرنے لگتی ہیں ؎

آنکھوں میں مری ابر رواں اور طرح کے
دل میں بھی کئی دشت تپاں اور طرح کے

ہیں پاس ترے تیر و کماں اور طرح کے
لفظوں کے سپر میرے یہاں اور طرح کے

احباب سناتے ہیں کوئی اور کہانی
ہیں میرے حریفوں کے بیاں اور طرح کے

متذکرہ بالا اشعار سے یہ اندازہ صاف طور سے لگایا جا سکتا ہے کہ رخسانہ جبین کا شعور کافی بالیدہ ہے۔ اُن کے تفکر میں فلسفیانہ گہرائی ہے اور یہی فلسفیانہ گہرائی انہیں معاصر شاعرات سے منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ نازک خیالی، لطیف جذبات و احساسات کو شعری پیکروں میں اس طرح ڈھالنا کہ اُن میں آفاقیت اور صداقت پیدا ہو جائے۔ سب کے سب کا کام نہیں ہوتا اس کے لیے کافی وقت کی ریاضت اور ایک طرح کا جنون عشق ناگزیر ہے اور یہ بات بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ رخسانہ جبین کے یہاں دونوں چیزیں موجود ہیں ؎

عطا کرے گا وہ منزل بھی جس نے جادہ دیا
عمل بھی دے گا وہی جس نے ہے ارادہ دیا

جبین گل پہ وہ تصویر اُبھر نہیں پائی
تو لوحِ سنگ پہ اک منظر فنا ہی لکھ

کروں گی میں ہی چراغاں تیرے جزیرے کو

مرے صدف کے مقدر میں تو سیاہی لکھ

وہ کور چشم جسے قتل گاہ کہتے ہیں
مجھے پناہ گہہ جسم و جاں دکھائی دی

وہ کوہسار وہ جھرنے وہ آبشار حسیں
وہ سایہ دار شجر سب بھلا دیئے میں نے

کشمیر کے معاصر شاعرات میں ایک اور نام نسرین نقاش کا اہمیت کا حامل ہے۔ رخسانہ جبین کے ساتھ ساتھ نسرین نقاش بھی شفق سوپوری کے معاصرین میں شمار ہوتی ہیں۔ نسرین نقاش ریاست جموں وکشمیر کی ایک باکمال شاعرہ ہیں۔ وہ نہ صرف ہند پاک بلکہ بیرونی ممالک کی خواتین قلم کاروں میں بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا چکی ہیں۔

سیدہ نسرین نقاش وادی گلپوش یعنی کشمیر کی ایک بستی نوا کدل سرینگر میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے مضافاتی علاقے میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم میں ایم۔اے پولیٹیکل سائنس اور ایم اے صحافت کی اسناد حاصل کرنے کے بعد وہ مکمل طور پر شعر وادب کی خدمت میں لگ گئیں۔ نسرین نقاش کا نام اگرچہ کشمیر کی مشہور شاعرات میں لیا جاتا ہے تاہم انہوں نے ادبی سفر کی شروعات افسانہ نگاری کی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا اور ماہنامہ ''روشن ادب'' میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد نسرین نقاش زیادہ تر شعر وشاعری کی طرف لگ گئیں اور اب تک ان کے کئی شعری مجموعے اور تنقیدی مضامین پر مشتمل کتابیں شائع ہو کر

منظرعام پر آ چکی ہیں۔جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

۱۔ لہو پکارتا ہے(شعری مجموعہ)

۲۔ دشت تنہائی (شعری مجموعہ)

۳۔ روحین جناب کی (شعری مجموعہ)

۴۔ دشت گماں (شعری مجموعہ)

۵۔ ادھوری خواہش (افسانوی مجموعہ)

۶۔ تنقید وتحقیق تک اور کشمیر ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک

سیدہ نسرین نقاش وادی کشمیر کی نئی نسل کے شعراء میں اپنی پہچان بنا رہی ہے۔وہ ایک جہاں دیدہ، انتہائی بے باک اور وسیع فکر ونظر کی خاتون ہیں۔وہ کافی شہرت ومقبولیت کے علاوہ لندن، جرمنی، سعودی عرب، دُبئی اور قطر جیسے بیرونی ممالک کے ادبی دورے کر چکی ہیں۔انہیں مینا کماری ایوارڈ، ساحر لدھیانوی ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ اور دُختر کشمیر جیسے اعزازات سے نوازا گیا ہے۔اردو ادب کے فروغ اور اس کی بقا کے لیے وہ قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہیں۔

نسرین نقاش کا ذہن کسی ایک صنف سخن تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ غزلیں، نظمیں، گیت، دوہے، آزاد نظمیں، آزاد غزلیں، معری نظمیں اور قطعات کے علاوہ ماہیے بھی ان کی طبع آزمائی میں شامل ہیں اور تقریباً وادی کشمیر کے علاوہ بیرون رسالوں میں متواتر طور پر چھپتی رہتی ہے اور مشاعروں میں زور شور سے حصہ لے رہی ہے۔ان کا اردو زبان کے ساتھ زبردست لگاؤ اور اردو کا ایک رسالہ ''صدا'' کی اشاعت ان کی ایک پہچان میں شامل ہیں۔ان کی اس صلاحیت اور خوبی کے ضمن میں اظہر جاوید ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نسرین نقاش اردو زبان کی باکمال شاعرہ ہیں، سرینگر جیسی جگہ جو مرکزی مقامات سے دور ہی نہیں، پچھلے کئی برسوں سے مختلف انداز میں کٹی ہوئی بھی ہے۔ انہوں نے وہاں یعنی نہ صرف اردو زبان کا بول بالا کیا بلکہ شاعری کا لامتناہی اُجالا بھی کیا۔ نسرین نقاش عمر کے اُس حصے میں ہیں جو خود تغزل کا روپ ہوتا ہے مگر انہیں اردگرد میں ہونے والے تلخ واقعات اور المناک تجربات نے حساس شاعرہ بنا دیا ہے۔ ان کی غزل کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بھارت میں ہونے والا شاید ہی کوئی بڑا مشاعرہ ہو جس میں ان کا نام شامل نہ ہو''۔ ۲۱

سید نسرین نقاش پر جس بات کا اظہار اظہر جاوید نے کیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ واقعی ایک اچھی اور بلند پائے کی شاعرہ ہے۔ جن کے کلام میں نسوانی جذباتی و احساسات اور زندگی کی متنوع رنگوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ حسن و عشق کی وارداتوں کے بیان پر مشتمل ہے مگر یہ بیان روایتی مضامین سے الگ ہے۔ اس کے پس پست اُن کے تجزیے مشاہدے ہے انہوں نے سچے جذبے، پُرخلوص اور شائستہ لب و لہجے میں اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار کیا ہے۔ وہ بغیر کسی بڑے شاعر کی تقلید کے خود اپنی آواز تلاش کر رہی ہیں۔ نسوانی آہنگ، طرز اظہار کی سادگی اور فطری پن نسرین نقاش کی دو نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ عورت کی نفسیات اور اُس کی داخلی کیفیات کو وہ اپنی ذاتی زندگی میں جانچتی پرکھتی ہیں اور سچے دل سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار مثال کے لیے پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہوں ؎

کوئی آئے گا نہ مجھ سا بخدا میرے بعد
ختم ہو جائے گا دستورِ وفا میرے بعد

بجھ ہی جائے گا کوئی دم میں چراغِ ہستی
ٹھہر جائے گا یہ طوفانِ بلا میرے بعد

بعد مرنے کے کھلیں گے مرے جوہر کیا کیا
ہو گی دنیا مرے نغموں پہ فدا میرے بعد

نسرین نقاش جدید شعراء میں ایک منفرد پہچان بنانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ان کے یہاں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ ذاتی سوچ کا عمل دخل ہے اور نئے راستوں کا اختیار کرنے کا حوصلہ ان کے یہاں بہتر طور سے ملتا ہے۔ان کے ہاں شعری کائنات کسی مخصوص اور محدود نظریئے کا پابند نہیں ہے اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کا تخلیقی سفر اور تخلیقی شعور کسی ایک درج پر سفر نہیں کرتا۔وہ اپنے ماحول اور گرد و نواح میں جو دیکھتی ہے محسوس کرتی ہے اُسے وہ لفظوں کا جامہ پہنا کر شعر کے سانچے میں ڈال دیتی ہے اور بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں مشاہدات و تجربات کو جلد از جلد تخلیقی جامہ پہنانے کا رجحان ملا ہے۔ان کے یہاں زندگی کے تمام تر مسائل اور تمام تر باریکیاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

نسرین نقاش اپنے کلام میں مقصد اور حقیقت کی ترجمان ہے اور اپنے تخلیقی عوامل میں نفسیاتی اور فلسفیانہ طریق کار کو اپنائے ہوئے شعر کی زبان اور اشعار کی اندرونی وحدت اور واقعات و حالات کو صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کے ساتھ ساتھ منصب فنکار اور مذہبی اور اخلاقی

عناصر کا بھی خیال رکھا ہے۔ وہ اپنے کلام میں بار ہا موقعوں پر زندگی کے موڑ پر آنے والے مشکلات ومصائب کے لیے تیار رہنے کے لیے ساماں کرنے کا درس دے رہی ہے زندگی چونکہ فانی ہے اور بقول کسے یہ مرمر کے جینے کا نام ہے۔ اس زندگی میں نسرین نقاش حصول ایمان کی متلاشی ہے اور خاص طور سے نوجوان امت کو زندگی کا کاروبار سنوارنے کی تلقین ہے۔

وہ کیا ظلمتوں میں اُجالے کریں گے
یہ بجھتے چراغوں کے بس میں نہیں ہے

ہر چند وہ فرشتوں میں شامل دیا مگر
ٹوٹا بھرم جب اُس کا تو چہرہ صہیب تھی

انسان نما لگا مجھے رنگ ولباس سے
دیکھی نہیں اگر چہ اُسے میں نے پاس سے

نسرین نقاش صاحبہ کی شاعری میں زبان و بیان کی صفائی اور ستھرائی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ صاف، سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ بے ساختگی اور شگفتگی سے مملو ہے۔ ان کا لب ولہجہ سیدھا بھی ہے اور انوکھا بھی۔ ان کے لہجے کی متانت وچستی اور علم العروض سے آراستہ ہے۔ اس میں نہ مبہم خیالات کی بھرمار ہے اور نہ ہی مشکل وگنجلک الفاظ کا استعمال۔ نسرین نقاش کے تروتازہ ذہن میں تخلیقی امکانات کی فراوانی بھی ہے اور الفاظ تراکیب اور استعاروں کو برتنے کا سلیقہ بھی ہے۔ جس کی بدولت ان کے اشعار میں معنی کی تہہ داری اور معنی

خیز مناظر ابھر کر ایک نیا ہی معنوی جمال پیدا کر دیتے ہیں۔ان کی عصری حسّیت اور معنوی تہہ داری نے ان کی غزلوں کو ان کی شناخت بنا دیا ہے۔جس سے نئی نسل کے شاعر امیں ان کے اپنی تخلیقی توانائی سے پہچانے جانے کے امکانات اور بھی روشن ہو جاتے ہیں۔نسرین نقاش کی شاعری میں بے پناہ تازگی اور نمو پذیری نظر آتی ہے اور مصروفیت سے انحراف کرتی ہوئی تمام تر شخصیت کا اظہار ہے۔اس بارے میں پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ ان کے کلام میں متکلم ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو اپنی امتیازی شناخت اور منفرد ذہنی رویے سے اپنا شعری میدان سونا بنا دیتا ہے۔اعترافی شاعری کے نمونے بہت کم لیکن رومانی جذبات سے لبریز ہے۔ رومانی جذبات کا اظہار بڑے متوازن اور شائستگی کے ساتھ ملتا ہے۔عصر حیسیت کے تناظر میں اُن کا رویہ بالکل حقیقی ہے۔

نسرین نقاش کے یہاں اپنے مادر وطن وادی کشمیر جنت نظیر کے قدرتی مناظر کی عکاسی برمحال انداز میں ہوئی ہے۔لیکن آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ نسرین نقاش کا ادبی سفر ابھی ان مراحل سے گزر رہا ہے جہاں بہت کچھ کرنے کے بعد بھی بہت کچھ کر گزرنے کی جستجو اور امکانات باقی رہتے ہیں۔نسرین نقاش انہیں نئی اور انوکھی جستجوؤں کے سُراغ میں سرگرم ہے اور اس سرگرمی پر غور کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا وسیع فکری تخلیقی عمل اردو ادب کے سرمائے میں مزید اضافہ کرے گا۔

شفق سوپوری کے معاصرین میں شبنم عشائی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔شبنم عشائی وادی کشمیر کی وہ ہر دل آواز کی ملکہ ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ان کی میٹھی آواز آج بھی وادی کشمیر کی فضاؤں میں ہر سو گونج رہی ہے۔اس آواز کی مالکہ ڈاکٹر شبنم عشائی ۱۲ر اپریل ۱۹۶۲ء کو سرینگر پٹن میں پیدا ہوئی۔ان کا تعلیمی سفر کافی روشن رہا ہے یہاں تک کہ

انہوں نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔شبنم عشائی ریڈیو کشمیر سرینگر اور دوردرشن سے ایک عرصے سے منسلک ہے۔ جہاں وہ اپنی موہ لینے والی آواز کی سحر کاری سے وادی کشمیر کے طول وارض کو محظوظ کرتی ہے۔

شبنم عشائی کا شعری سفر ۱۹۹۳ء کے بعد شروع ہوا جب ان کا پہلا شعری مجموعہ ''اکیلی'' کے نام سے قارئین کی توجہ کا مرکز بنا۔اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے غلام نبی ناظر لکھتے ہیں:

> ''شبنم کی شاعری میں غم واندوہ کا ایک دلچسپ فطری رقص ہے۔ یہاں آرزوؤں کے بازار سجے سجائی دکھائی دیتے ہیں۔ تصور میں ابھارے تموج کا نظارہ ہے۔صحرا کی وسعت بھی اور دیوانگی کے آداب بھی''۔ ۲۲

شبنم عشائی کے شعری تخلیقات میں ''اکیلی'' کے علاوہ اُن کی نظموں کا انتخاب ''میں سوچتی ہوں'' منظر عام پر آچکا ہے۔علاوہ ازیں ہندی رسم الخط میں نظمیں ''من بانی'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور ان کا آخری مجموعہ کتھارس کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

شبنم عشائی کی شاعری میں بہت حد تک للہ عارفہ کی عارفانہ شاعری کے پرتو دکھائی دیتے ہیں۔عورت ذات کی ازلی محرومی زندگی کے مسائل، سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے سبب گھریلو نظام میں اعتدال وسکون کے فقدان اور مرد کی عورت پر بالادستی کو شبنم عشائی نے اپنی نظموں میں کچھ اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ اُن کے حزن وملال اور داخلی طلاطم خیزی نے پدرانہ سماج کے تئیں احتجاجی رویے کی صورت اختیار کرلی ہے۔اس سلسلے میں وہ تمام روایتی نسوانی اقدار پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہیں۔کئی نظموں میں تو وہ مرد کی عیاریوں اور اس کی

عیاشیوں کا پردہ اس طرح چاک کرتی ہے کہ ازدواجی رشتوں کا تقدس پامال ہونے لگتا ہے۔

زبیر رضوی شبنم عشائی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''شبنم عشائی ملال کی شاعرہ ہیں ان کا ملال محبت آمیز جذبوں کے رائیگاں جانے اور اپنی ذات کے کسی کے ہاتھوں مٹ میلا ہیو جانے سے پیدا ہوا ہے۔ اس ملال میں بکھر کے سمٹ جانے، بجھ کر جل اٹھنے اور ڈوب کر اُبھر آنے والی رجائیت بھی شامل ہے۔ شبنم خود سپردگی کی دلدادہ ہیں مگر ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو ہم آغوش کیفیتوں سے الگ کر لینے پر بھی قادر ہیں ان کے اندر کی نسائی نرمی اور رفاقتوں کی آنچ سے پگھل جانے کی وارفتگی، جذبے اور کیفیت کی سطح پر انہیں کمزور نہیں کرتی، انہیں اپنی ذات کے تموج سے بھی لگاؤ ہے۔ ہندوستانی عورت چاہے لوک گیتوں میں ہو یا شاعری میں، برہا یا ہجر زدہ ساعتوں کی قیدی کہی جاتی ہے۔ شبنم کی شاعری برہا کی اُس عمومی کیفیت اور تصور سے بڑے مختلف ہے۔ یہ شاعری ایک ایسی لڑکی کے عشق آمیز جذبوں کا والہانہ اظہار ہے جو ٹوٹ کر پیار کرنے کے ساتھ ساتھ ٹوٹ کر چاہے جانے کی آرزومند ہے۔ عشق میں ناکامی اسے راتوں کو جاگ کر تکیے بھگونے پر کچھ دیر کے لیے تو اُکساتی ہے مگر تھوڑے وقفے کے بعد آنکھوں میں خوابوں کی فصل پھر لہلانے لگتی ہے

یہ لڑکی پریشانی نظری کی قائل نہیں اپنے عشق اور اس کی شدت
کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتی''۔ ۲۳

شبنم عشائی کی شاعری واقعی ایک ایسی خاتون کی شاعری ہے جو نسوانی جذبات و احساسات، درد و کسک، وارفتگی اور زندگی کے نشیب و فراز کا گہرا شعور و ادراک رکھتی ہے، وہ اپنی صدائے احتجاج کو انسانی معاشرے میں دور اور دیر کے لیے برقرار رکھنے کی متمنی ہیں۔ حسن و عشق اور زندگی کے اس چکریوں میں کیا کچھ باقی رہتا ہے اور کیا فنا ہو جاتا ہے۔ اسی سانحہ کو شبنم عشائی نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے وہ ظاہری حُسن و جمال کے بدلے داخلی حسن کو کھوجتی ہیں۔ وہ عورت ذات کو اُس کے صدیوں سے چلے آرہے سماجی بندھنوں اور خاندانی روایات کو توڑ کر اُسے آزادانہ طور پر زندگی گزارنے، اپنے اندر خود اعتمادی اور خود کفیل زندگی جینے کی تلقین کرتی نظر آتی ہیں۔ اُن کی نظموں کی کئی سرحدیں اور کیفیتیں ہیں کہیں آشفتگی ہے، کہیں آسودگی، کہیں ہجر و وصال ہے تو کہیں پورا وجود سراپا آرزو نظر آتا ہے۔ دیپک بُدکی نے شبنم عشائی کی شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''شبنم عشائی کی شاعری ذاتی کرب کی شاعری ہے۔ وہ نہ
سماج کے مسئلوں پر منشور لکھتی ہیں اور نہ ہی واہ واہ کی طلب
میں گل و بلبل اور شمع و پروانے کی باتیں کرتی ہیں۔ وہ ایک
عورت ہیں وہی عورت جو خواب بنتی ہے جس کے دل میں ایک
خوبصورت گھر بنانے کی آرزو ہے اور جو اپنے محبوب کی محبت
میں سرشار ہونا پسند کرتی ہے۔ تاہم انہیں اس بات کا شدید

احساس ہے کہ عورت کے یہ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے
کہیں بنا بنایا گھر ٹوٹ جاتا ہے تو کہیں ہرجائی ہو جاتا ہے اور
کہیں خود اسے در بدر ہونے کا فرمان جاری کیا جاتا
ہے''۔ ۲۴

فرید پربتی بھی شفق سوپوری کے معاصر شعراء میں شمار ہیں۔فرید پربتی کا اصلی نام غلام نبی بٹ اور فرید پربتی قلمی نام رکھتے تھے۔آپ کی پیدائش ۴/ اگست ۱۹۶۱ء کو حول سرینگر میں ہوئی۔آپ کے والد صاحب کا نام خواجہ حبیب اللہ بٹ اور والدہ کا نام مصرہ بیگم تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی آف کشمیر میں داخلہ لیا جہاں سے آپ نے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔آپ تعلیم مکمل کرنے کے بعد درس وتدریس میں مصروف عمل رہے اور ان کی جواں مرگی سے وادی کشمیر ایک ہونہار محنتی اور ذہنی شاعر، نقاد اور محقق سے محروم ہو گیا ان کا انتقال ۱۶/ دسمبر ۲۰۱۱ء میں ہو گیا ہے۔ فرید پربتی کا جوار دو سرمایہ قابل دید بھی ہے اور قابل فخر بھی وہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ابرتر
۲۔ آب نیاں
۳۔ اثبات
۴۔ فریدنامہ
۵۔ گفتگو چاند سے
۶۔ ہزار امکان
۷۔ خبر تحیر

۸۔ ہجوم آئینہ

۹۔ شہ زور کاشمیری حیات وفن

۱۰۔ شاہ حاتم دہلوی حیات اور کارنامے

۱۱۔ اردو ادب میں اصلاح سخن کی روایت

۱۲۔ خلیل الرحمان کی تنقید نگاری

۱۳۔ اردو ادب میں تاریخ گوئی کی روایت

فرید پربتی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ان کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے نام اور کام سے اُردو دنیا بخوبی واقف ہیں۔وہ جدید نسل کے شعراء میں شمار تھے۔انہوں نے ایسے پُرآشوب وقت میں شاعری کا آغاز کیا جب کشمیر کا پورا ڈھانچہ متزلزل ہو چکا تھا۔فرید پربتی نے بقول ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری:

> ''ہمعصر اردو شاعری میں اپنا خاص مقام حاصل کیا اور اس ریاست سے باہر سب سے زیادہ دار حاصل کرنے والا پہلا اردو ادیب ہے۔شاعری کے ساتھ ساتھ شاعری کی تنقید پر اُستادانہ مہارت رکھتے تھے اور اردو میں صنف رباعی کی باز یافت ان ہی سے ہوئی،،۔۲۵

فرید پربتی خالق حقیقی کی طرف سے ایک فلسفی کا ذہن، مصور کی آنکھ، عاشق کا کلیجہ اور شاعر کا دل لے کر پیدا ہوا تھا۔وہ ایک دکھ بھری زندگی میں پریم رس گھولتا ہوا شاعر تھا۔اس کے کلام میں کسی نظریے یا رجحان کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی بلکہ اگر کہیں کسی رجحان کا عکس نمایاں ہوتو وہ غیر شعوری طور پر ابھر کر آیا ہے لیکن اردو ادب کا یہ روشن ستارہ روایتی شعراء سے

متاثر تو نہیں ہیں لیکن ان کے کلام میں کہیں کہیں میرؔ کے اثرات ضرور دیکھے جا سکتے ہیں۔ڈاکٹر شبینہ پروین فرید پربتی کے ضمن میں لکھتی ہیں:

''فرید پربتی کشمیر کے جدید شعراء میں اہم مقام رکھتے تھے۔ بہت ہی کم عرصے میں انہوں نے اپنی حیثیت کو سنوارنے میں کامیابی حاصل کی۔فرید صاحب غزلیں لکھتے ہیں لیکن رباعیاں بھی تمام فنی لوازمات کی روشنی میں لکھ رہے تھے۔فرید صاحب کی شاعری میں کرب واذیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ فرید صاحب کا اسلوب واظہار انفرادیت کا حامل رہا ہے اور تخیل کا کینواس بہت ہی وسیع۔انہوں نے شاعری میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کا بھی اظہار کیا ہے۔بعض اوقات تو انہوں نے میرؔ کی تقلید کی ہے ان کے اشعار میں دکھ درد کا اظہار میرؔ کی طرح پایا جاتا ہے''۔۲۶

فرید پربتی غزل اور رباعی دونوں اصناف کے مزاج آشنا شاعر تھے۔اگرچہ وہ تنقید میں بھی کارہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں لیکن غزل اور رباعی ان کے محبوب ترین اصناف رہے ہیں۔اگرچہ زندگی کی بھرپور عکاسی کرنے والا یہ شاعر ہم میں موجود نہیں ہے لیکن زندگی سے جڑے معاملات کا شعور وبصیرت اور فکر وشعور میں وسعت وکشادگی کا پتہ ان کی شاعری سے ضرور لگایا جا سکتا ہے۔اُن کے مختلف اصناف پر کامل دسترس کا اندازہ ڈاکٹر اشرف آثاری کے اس تبصرے سے لگایا جا سکتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''فرید پربتی صرف اردو شاعر ہی نہیں بلکہ تنقید میں بھی ان کا نام لیا جارہا ہے۔شاعری میں صنف غزل ان کی محبوب ترین صنف سخن ہے اور پھر رُباعی بھی۔فرید پربتی ان لوگوں کی صف میں شامل ہیں جنہوں نے غزل کا مزاج اچھی طرح سے سمجھا اور جانا ہے اور جو اردو غزل کی تہہ داری وطرحداری، تفکر و متانت، لہجے کی نرمی وشگفتگی، صفائی وستھرائی، سلاست وروانی، بے ساختگی و برجستگی، ندرت خیال، اور الفاظ واستعارات کے موثر انتخاب سے واقف ہیں۔غزل گوئی میں فرید پربتی کا وسعت مطالعہ ذہنی فراست وذہانت، ان کی ہاں موجود ذخیرۂ الفاظ اور منفرد لب ولہجہ اور اسلوب و بیان ان کے کافی کافی کام آگیا ہے''۔۲۷

فرید پربتی بلاشبہ وسعت نظر اور شاعری کے تمام تر لوازم سے بخوبی آشنا تھے۔زندگی کا کوئی بھی گوشہ ان کی گہری نظر اور فنکارانہ نظام سے آزاد نہ تھا۔انہوں نے ادب کے لوازم کو مدنظر رکھ کر زندگی کے تصورات اور جذبات کے ارتعاشات سے حد درجہ رشتہ استوار روا رکھا ہے۔چونکہ انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے محبوب صف غزل اور رباعی ہی رہے ہیں۔جہاں ان کی غزل فنی نزاکتوں سے عاری نہیں ہے وہی رباعی کے نازک صنف میں بھی انہوں نے نام کمایا ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہوئے۔

ستم گری کا نکالا ہے اس نے طور نیا
پرانے زخم پہ دیتا ہے زخم اور نیا

وہ میرے خواب بجھانے کی دھن میں رہتا ہے
اسی لیے میرے اندر بیا ہے شعلہ اپنا

مدتوں جی لئے مگر اب تک
زندہ رہنے کے ڈھب نہیں آتے

ٹھن گئی جنگ کے حریفوں میں
امن کے روز و شب نہیں آتے

فرید پربتی کے یہاں حسین اور خوبصورت جذبات اور تصورات کی کارفرمائی ہے۔ان کا لہجہ اور انداز ان کا اپنا ہے ہاں ان کے بارے میں ایک عام خیال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کا لہجہ اور درد کرب کا اظہار میر کی تقلید میں ملتا ہے۔ چونکہ ادب شناس اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میر کس بلند پایہ حیثیت کے شاعر رہے ہیں بلکہ دوسرے بڑے شاعروں کو بھی میر کی بلندی کا اعتراف تھا تو کسی بڑے شاعر کی خصوصیات میں سے کسی ایک خصوصیات کو اپنانا یا پھر تقلید ہی پر کھرا اُترنا بھی ایک بہت بڑا ہُنر ہے۔اس طرح فرید پربتی ایک اچھے اور بلند شاعر کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔فرید پربتی کے بارے میں مقتدر نقادوں نے بحیثیت غزل گو اور بحیثیت رباعی گو انہیں اپنے خیالات سے دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن راقم اپنی بات ختم کرنے سے پہلے صرف پروفیسر عتیق اللہ کی بہترین رائے رقم کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ فرید پربتی کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''فرید پربتی خواہ غزل کو اپنا ذریعہ اظہار بنائیں کہ رباعی یا کسی اور صنف کو، ان کی سج دھج ہمیشہ دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ فرید پربتی کی صلاحیت حس بے حد شدید ہے، وہ چیزوں سے میرے ہی جھانکنے کی کوشش نہیں کرتے اُن کے اندر اُترنے کی سعی بھی کرتے تاکہ جہاں اندر جہان کی کیفیات کو اپنے تجربے کا حقہ بنا سکیں۔ ان کیفیات کو انہوں نے رباعی میں بڑی خوبی اور بڑے اختصاص کے ساتھ رقم کیا ہے۔ رباعی فرید پربتی کے باطن کا سراغ ہے۔ انہوں نے اس کی لچک پزیری سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ فائدہ ان معنوں میں کہ جذبوں کے اظہار میں غزل کے دو مصرعے جہاں ناکافی ہوتے ہیں وہاں رباعی انہیں بخوبی سہارا دیتی ہے۔ اس طور پر کہ وہ سارے ذہنی اور جذباتی تجربے جو پیرایہ غزل سے زیادہ سبط و کشاد کے متقاضی ہیں۔ رباعی میں انہوں یہ سہولیت ادا کیا جا سکتا ہے، باوجود اس کے لیے رباعی کا فن بھی تعمیر و توضیح کے منافی ہے، فرید، لفظ کے فریب سے بھی آگاہ ہیں اور معنی میں بھی یکسوئی کے قابل نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ معنی کے داخلی امکانات ہمیشہ تعلق کو راہ دیتے ہیں''۔ ۲۸

حواشی

۱: رفیق راز، آئینۂ تمثیل دارازر یحانہ اختر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱

۲: کشمیر میں اردو شاعری، از محمد یوسف خان عادل، ص ۱۵۸

۳: نخلِ آب از رفیق راز

۴: رفیق راز، آئینۂ تمثیل دارازر یحانہ اختر ۲۰۱۰ء، ص ۱۹

۵: اُردو غزل کی ثقافتی اساس: از ڈاکٹر شبینہ پروین، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۴

۶: تنقید نما از مظہر امام، ۲۰۰۴ء، ص ۴۱

۷: رفیق راز، آئینۂ تمثیل دارازر یحانہ اختر، ۲۰۱۰ء ص ۱۱۱

۸: ایضاً، صفحہ نمبر ۶۵

۹: ایضاً، ص ۳۱

۱۰: وادی کشمیر کے چند اہم شعراء از جاوید انور، ۲۰۱۲ء ص ۱۳۷

۱۱: تنقید نما از مظہر امام، ۲۰۰۴، ص ۴۵

۱۲: وادی کشمیر کے چند اہم شعراء، از جاوید انور، ص ۱۵۳

۱۳: خالد بشیر شخصیت اور فن از خالد بشیر، میزان پبلیکیشن سری نگر ۲۰۱۳ء

۱۴: کشمیر امکانات از ڈاکٹر نذیر آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۲ء

۱۵: ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب از حامدی کاشمیری

۱۶: وادی کشمیر کے چند اہم شعراء، ص ۱۷۴

۱۷: سبو چہ از ڈاکٹر نذیر آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

۱۸: تنقید نما از مظہر امام، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴

۱۹: اردو غزل کی ثقافتی اساس از ڈاکٹر شبینہ پروین، ص ۱۳۹

۲۰: ایضاً

۲۱: ساتواں در کا شاعر، حکیم منظور از نگہت فاروق ۲۰۱۲ء

۲۲: شیرازہ جموں و کشمیر اردو ادب نمبر، جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز

۲۳: بحوالہ کشمیر میں اردو شاعرات

۲۴: بحوالہ من بانی از شبنم عشائی

۲۵: دبستان جموں و کشمیر میں اردو از ڈاکٹر محی الدین قادر زور کشمیری، ص ۴۴

۲۶: اُردو غزل کی ثقافتی اساس از ڈاکٹر شبینہ پروین، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۸

۲۷: عصری ادب کے رنگ و آہنگ از ڈاکٹر اشرف آثاری، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۵

۲۸: ہجوم آئینہ از فرید پربتی، میزان پبلیکیشن سری نگر ۲۰۱۳ء

باب ہفتم

شفقؔ سوپوری مشاہیر ادب کی نظر میں

(چند منتخب اقتباسات)

(۱) شمس الرحمان فاروقی

شمس الرحمان فاروقی اردو زبان وادب کی ایک عبقری شخصیت کا نام ہے انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی کئی اصناف میں ایسے عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں جن کا اعتراف ساری دنیا کرتی ہے۔ چنانچہ تنقید ہو یا تحقیق، فکشن ہو یا لغت یا پھر شرح انہوں نے ادب کے ہر میدان میں اپنے بے پناہ علم اور صلاحیتوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان نے علامہ اقبالؔ کے بعد فاروقی کی صورت میں ایک عظیم شخصیت پیدا کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے مشرقی شعریات، روایات، رسومیات اور لسانیات کے تعلق سے جو مطالعے پیش کئے ہیں اُن سے اردو ادب کا دامن وسیع ہو گیا۔ فاروقی نے میرؔ اور غالبؔ کی شرح لکھ کر ان دونوں عظیم شعراء کے مطالعے کے لیے نہ صرف نئے دریچے کھول دیئے بلکہ ان کی تعین قدر کا کارنامہ بھی انجام دیا۔ اُن کا ناول ''کئی چاند تھے سر آسمان'' اپنی نوعیت کا ایک انوکھا کارنامہ ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''قبض زماں'' اور اُن کے افسانے اُنہیں بطور فکشن نگار ایک اعلیٰ مقام دلانے کے لیے کافی ہیں۔ اردو کی تاریخی حیثیت مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ فاروقی نے لغت نگاری میں بھی اپنے لسانی شعور اور علم ادراک کا ثبوت دیا۔ فاروقی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک کی آبیاری کی۔ ایک طویل مدت تک اپنی نوعیت کے انوکھے ادبی رسالے ''شب خون'' کے ذریعے سے انہوں نے نہ صرف جدیدیت کے رجحان کی بھرپور تبلیغ کی بلکہ نئی نسل سے وابستہ جنیون شاعروں اور ادیبوں کی راہبری کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ اس مختصر سے تعارف میں فاروقی کے ادبی کارناموں کی تفصیل بیان کرنا ناممکن ہے۔ فاروقی ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں ان

الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں:

(۱)

''شفق سوپوری کی شاعری میرے لیے وادی کشمیر کے دلکش اور دلچسپ تحفے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اُن کے کلام سے اُس وقت سے واقف ہوں جب انہوں نے شعر گوئی شروع کی تھی۔ اچھی خاصی مدت یعنی تقریباً دو دہائیاں گذر جانے پر بھی انہوں نے غزلوں کا انبار نہیں لگایا۔ اور اس زمانے کی عام روش کے برخلاف ایک بھی مجموعہ شائع نہیں کیا۔ یہ ان کی سلامت طبع، فنی دیانت اور خوب سے خوب تر کی تلاش کی دلیل ہے (دشت میں دور کہیں) کی غزلوں میں دردمندی اور فکرمندی کے ساتھ ساتھ ایک درویشانہ تمکین اور بے نیازی کا انداز جگہ جگہ جھلکتا ہے۔ شفق سوپوری نے غزل کو صرف ذاتی واردات تک محدود رکھا ہے لیکن اس واردات میں گردوپیش کے انسانوں اور شجر حجر کے افسانے بھی شامل ہیں، میں انہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے آسان اور مقبول راہوں کو چھوڑ کر اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے جو اگرچہ مشکل ہے لیکن اس کے مسافر کو قدم قدم پر کامیابی کا مژدہ بھی سناتی ہے''۔۱

(۲)

''ہمارے یہاں بھی ایک بہت پرانی اصطلاح ''روانی'' ہے جسے ہم بنیادی طور پر شعر کی موسیقی سے متعلق نہیں مانتے لیکن اس پر گفتگو الجاحظ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے کہ شعر کی روانی سے کیا مراد ہے اور اس روانی کے اسباب یا سرچشمے کیا ہیں، یہ مسئلہ ابھی پوری طرح حل نہیں ہوا ہے۔ ہمارے نوجوانوں میں شفق سوپوری تنہا ہیں جو ان موضوعات پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''شاعری، موسیقی اور لسانیات'' کچھ دن پہلے شائع ہوئی تھی اور وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے کچھ اور مسائل بھی اُٹھائے ہیں خاص کر غزل کے بعض شعراء نے جو بحریں برتی ہیں، ان کا تجزیہ ان کی دریچوں کا تجربہ، ان کی پس آمد اور اب سب سے بڑھ کر یہ کہ مشہور مغنیوں کی گائی ہوئی غزلوں کی فہرست اور اس راگ کی صراحت، جس میں وہ غزل گائی گئی ہے، ان معلومات نے اس کتاب کو بہت قیمتی بنا دیا ہے''۔ ۲

(۲) پروفیسر ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی اردو ادب کی ایک اعلیٰ پایہ شخصیت ہے۔ انہوں نے تنقید و تحقیق میں جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ مشرقی شعریات کے اہم

جائزوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید ترین ادبی رجحانات کے ایسے مطالعے کئے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آپ نہ صرف مشرقی شعریات کی روایات اور رسومیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں بلکہ عالم گیر سطح پر نمودار ہونے والے نئے رجحانات کا علم بھی رکھتے ہیں۔ اردو تنقید کو عالم گیر معیار پر لانے کے سلسلے میں ان کی تنقیدی صلاحیتوں نے کافی اہم کردار ادا کیا ہے وہ شفق سوپوری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''شفق سوپوری اُن معدودے چند نوخیز شاعروں میں ہیں جن کو اپنی شناخت کے لیے ترقی پسندی یا جدیدیت جیسی بیساکھی کی ضرورت نہیں۔ ان کی لفظیات بھی کسی مخصوص ادبی تحریک یا گروہ کی حد بندیوں سے مختلف ہیں اور ان کا مافی الضمیر بھی بلاشرکت غیرے اپنا ہے۔ یہ اتفاق نہیں تو اور کیا ہے کہ شفق کی شاعرانہ سرگرمیوں کے عروج کا زمانہ عین وہی رہا ہے جو وادی کشمیر میں بے اطمینانی اور خلفشار کا زمانہ ہے۔ اپنی معاصر صورت حال کا سامنا کرنے، اس سے متاثر ہونے اور اس کے ردعمل کے طور پر مثبت یا منفی خیالات سے نبرد آزما ہونے کا نتیجہ ہے کہ انکی شاعری میں جبر کے ساتھ اختیار اور صبر کے ساتھ احتجاج جیسے رویوں کی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ چونکہ شفق کا دردمند دل اپنے احساسات وجذبات کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا۔ اس لیے ان کی شاعری میں جذبہ ہو یا احساس، انفرادیت کے بجائے اجتماعیت میں اور ذات کی

حدود سے نکال کر عام انسانوں کی تعلیم میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آتا ہے ان کے اندر کا حساس شاعر یوں تو دکھی بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات آبدیدہ بھی نظر آتا ہے مگر اس نوع کی کوئی کیفیت یا دقت ان کی شخصیت کو پسپائی کے احساس سے دوچار نہیں کرتی۔ وہ اکثر اپنے داخلی تجربے کو خارجی مشاہدے سے ہم آہنگ کر کے اسے بامعنی بنا دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ حتمی کیفیت اکثر خارجی تلازمات سے مربوط ہو جاتی ہے اور ذات اور ماورائے ذات میں ثنویت باقی نہیں رہتی_____ وہ متحرک اور فعال طور پر اپنے گرد و پیش کی صورت حال میں شریک ہونے کا بھی احساس دلاتے ہیں اور اس پر اپنے سرگرم ردعمل کا بھی ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ احتجاج بھی کرتے ہیں، طنزیہ لب ولہجہ بھی اختیار کرتے ہیں اور بسا اوقات درگزر کرنے اور راست ردعمل کا اظہار کرنے کے درمیان توازن بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں_____ شفق سوپوری کی شاعرانہ انفرادیت میں متنوع لہجوں اور رنگا رنگ احساسات وتجربات کا عمل دخل بہت نمایاں ہے۔ مگر یہ بات قابل وثوق انداز میں کہی جاسکتی ہے کہ شفق کی آواز ان کی اپنی آواز ہے، مانگے کا اُجالا نہیں۔ وہ اپنی روایت سے کسب فیض ضرور کرتے ہیں مگر روایت کو کشید کر کے اس میں اپنے

خون جگر کا رنگ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ یہی ان کا امتیاز بھی
ہے اور یہی ان کی غزلوں کا انوکھا پن بھی ہے''۔ ۳

(۳) پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی اردو زبان کے ایک اہم شاعر اور نقاد ہیں۔ اگر چہ وہ اپنی شاعرانہ انفرادیت اور خصوصیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں اور اردو زبان کے تمام تنقید نگاروں نے اُن کی سخن وری کے کمالات کا اعتراف کیا ہے تاہم وہ اُردو زبان کے صف اول کے تنقید نگاروں میں شامل ہیں۔ وہ بے پناہ علمی، ادبی اور تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے جدید شعری منظرنامے کا ایک انوکھے طرز سے جائزہ لے کر کئی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ عالمی ادب کے نئے رجحانات کے ساتھ ساتھ اردو کی کلاسیکی شعریات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی تنقیدات کے مخصوص انداز ے نے انہیں اردو کے تنقید نگاروں میں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی شفق سوپوری کے تعلق سے یوں لکھتے ہیں:

''شفق سوپوری سے میرا تعارف ان کے ایک تحقیقی مقالے کی
وساطت سے ہوا تھا۔ ان کے بارے میں پہلا تاثر جو میرے
ذہن پر قائم ہوا یہی تھا کہ وہ اپنی شعری روایت پر غیر معمولی
گرفت رکھنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی اور راگ راگنیوں
کے مضمرات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ان کا جو کلام کبھی کبھار
ادبی رسالوں میں شائع ہوتا تھا اس سے صاف اندازہ کیا

جا سکتا ہے کہ وہ اپنے عصر کے مزاج کو سمجھنے کے ساتھ وہ شعری اظہار اور عمل کے تقاضوں کو خوب سمجھتے ہیں اور اپنی ایک الگ پہچان قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں زبان و بیان کی باریکیوں کا جیسا شعور حاصل ہے اس دور میں کم کم دکھائی دیتا ہے لیکن ان کی شاعری فکری اعتبار سے بھی بہت ثروت مند ہے اور ہر دور کے سنجیدہ قاری سے ایک رابطہ استوار کر سکتی ہے۔ ''دشت میں دور کہیں'' ایک خوبصورت اور خوش آہنگ مجموعہ کلام ہے۔ اس کا جمالیاتی ذائقہ اس عہد کی عام شاعری سے مختلف ہے۔ اچھے شعر کا ذوق رکھنے والوں میں یہ کتاب یقیناً پسند کی جائے گی''۔ ۴

(۴) پروفیسر حامدی کاشمیری

پروفیسر حامدی کاشمیری ایک منفرد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایے کے نقاد، فکشن نگار اور محقق ہیں۔ جدیدیت کے دور سے تعلق رکھنے والے شعراء میں اُن کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کی شاعرانہ انفرادیت کا اعتراف اردو کے سب اعلیٰ پایہ کے تنقید نگاروں نے کیا ہے۔ حامدی کاشمیری نے مغربی شعریات کے ساتھ ساتھ مشرقی شعریات کے کئی اہم جائزے لیے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کی نظر جہاں مغربی شعریات پر گہری ہے وہیں وہ مغربی شعریات کا بھی بھرپور علم رکھتے ہیں۔ انہوں نے اگرچہ غالبؔ، میرؔ، اقبالؔ اور کئی اہم شعراء کے کلام کا جائزہ لے کر ان کے مطالعات کے نئے گوشے

روشن کئے ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''اکتشافی تنقید'' کا نظریہ ہے۔ حامدی کاشمیری نے ''اکتشافی تنقید'' کے نظریے کو ایک مستحکم بنیاد کے ساتھ پیش کیا ہے اور کئی ادبی شاہکاروں کا جائزہ ''اکتشافی تنقید'' کے نظریئے سے لے کر اردو ادب میں تنقیدی جمود، یکسانیت اور تکرار دور کرنے کا ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری شفق سوپوری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

(۱)

''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کشمیر کی نئی نسلوں میں شفق سوپوری نہ صرف نسبتاً گہرے تخلیقی شعور کا احساس دلائے ہیں بلکہ وہ لفظ و پیکر کی فراوانی اور تازہ کاری کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ اُن کی شعری فضا میں حد بندی، یک رنگی اور گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ہے بلکہ آزادی، توسیع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے، اور یہ خاصیت نئے شعراء میں بہت کم ملتی ہے''۔ ۵

(۲)

''شفق سوپوری کو میں اپنے عزیز ترین اور قابل ترین شاگردوں میں شمار کرتا ہوں۔ ہمارے تعلقات لگ بھگ تنتیس برس پر محیط ہیں۔ اس دوران میں نے شفق سوپوری کی شخصیت کے کئی نادیدہ جہانوں کو دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے فن کے نئے جہانوں کو بھی دیکھا۔ شفق سوپوری

اپنے اُستادوں کونہایت قدر، احترام اور تقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شفق جب بھی ہمارے غریب خانے پر آتے ہیں تو ہمیں اُن کی محبت، خلوص اور سعادت مندی دیکھ کر ایک عجیب قسم کی طمانیت اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ شفق بہت عرصے تک کشمیر یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ رہے۔ ایک شاگرد کی حیثیت سے میں نے انہیں نہایت ہوش مند، باسلیقہ اور مہذب پایا۔ وہ اپنے استادوں کے سامنے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور اگر مجبوراً کچھ بولنا بھی پڑے تو حد ادب کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ اتنے ادبی خدمات کے باوجود اور اس قدر شہرت پانے کے باوصف شفق کی ذات میں کسی قسم کی اَنا نہیں پائی جاتی۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ شفق سوپوری جیسا بلند پایہ شاعر اور ادیب میرا شاگرد رہا ہے''۔٦

(۵) پروفیسر قدوس جاوید

پروفیسر قدوس جاوید ایک اعلیٰ پایہ کے محقق، تنقید نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلیقہ مند اور باہنر صحافی بھی ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر تنقید کے میدان میں جو اہم کارنامے انجام دیئے ہیں اُن کا اعتراف اردو کے تمام حلقوں میں ہوا ہے۔ وہ سماجیات، جمالیات، لسانیات اور شعریات کا گہرا علم اور شعور رکھتے ہیں۔ عالم گیر سطح پر نمو پذیر ہونے والے نئے رجحانات پر اُن کی گہری نظر ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو اُنہیں ایک منفرد اور ممتاز نقاد بنانے میں

کارفرما ہیں۔ وہ اگر چہ اردو کی شعری روایات اور رسومیات سے واقف ہیں مگر انہوں نے جو تجزیئے تخلیقیت، بین المتونیت، متن، قرأت اور مفی کے ساتھ ساتھ ہیتی تنقیدی تھیوری، ساختیاتی تھیوری، تانیثی تھیوری، قاری اساس تنقید تھیوری وغیرہ کے علاوہ جدیدیت، مابعد جدیدیت کے تعلق سے جو تجزیئے پیش کئے ہیں وہ اُن کی تنقیدی، علمی، تجزیاتی شعور پر دلالت کرتے ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید کا جدید طرز فکر اور عمل انہیں معاصر تنقید نگاروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتا ہے وہ ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

(۱)

''شفق سوپوری کی غزلوں میں کشمیر کی منفرد تہذیب و ثقافت کے عناصر تو ہیں ہی، لیکن شفق سوپوری کی شناخت محض کشمیر کے شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُردو دنیا کے چند معتبر شعراء کے ساتھ ہوتا ہے۔ کشمیر میں رفیق رازؔ، ایاز رسول نازکی، رخسانہ جبین، نذیر آزادؔ وغیرہ اُن کے معاصر شعراء ہیں، لیکن کشمیر سے باہر اُردو کے نمائندہ معاصر غزل گو شعراء مثلاً عرفان صدیقی، مہتاب حیدر نقوی اور عبدالاحد سازؔ وغیرہ کے ساتھ اگر کشمیر کے کسی اُردو شاعری کا نام پورے وثوق کے ساتھ لیا جاسکتا ہے تو وہ شفق سوپوری ہی ہیں''۔ شفق سوپوری کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کے یہاں وقت اور زمانہ کے ساتھ بدلتے ہوئے تخلیقی رویوں کا پورا احترام ملتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی شفق سوپوری غزل

کی کلاسیکی روایات کے تقدس کو کہیں بھی پامال نہیں کرتے بلکہ ان کی جدید ترین غزلیں بھی غزل کے فنی، فکری اور جمالیاتی جڑوں سے اپنا رشتہ قائم رکھتی ہیں۔ شفق سوپوری کیونکہ زبان دان ہیں، اہل زبان سے کہیں زیادہ بہتر اور پختہ لسانی شعور رکھتے ہیں اس لیے شفق سوپوری کے یہاں الفاظ کا شعری برتاؤ ان کے پورے تہذیبی، لسانی اور اقداری نظام کا پرتو ہوتا ہے۔ اگر شفق سوپری کے اب تک کے شعری سرمائے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ شفق سوپوری زندگی کی طرح شاعری میں بھی تقلید کے قائل نہیں۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ شاعری افتراق اور اجتہاد سے پنپتی ہے، اسی لیے شفق سوپوری کی غزلوں میں تغزل کے زیر سایہ تجربہ پسندی کی دھیمی دھیمی آنچ بھی نظر آتی ہے۔ شفق سوپوری نے معنی اور مضمون کی تازہ کاری کے حوالے سے سے تجربہ پسندی سے بھی کام لیا ہے لیکن شفق کے یہ تجربے غزل کی لطافت ونزاکت اور فنی اور جمالیاتی قدروں کو شکستہ نہیں کرتے جیسا کہ ہم ظفر اقبال، ساقی فاروقی اور محمد علوی اور ندا فاضلی کی غزلوں میں دیکھتے ہیں۔ اعلیٰ اور عمدہ شاعری کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ اس سے شاعر کی خود اعتمادی، بُردباری، زندہ اور متحرک صداقتوں پر مبنی تخیل اور تصور کی بلند پردازی کی کرنیں بھی پھوٹتی ہوں اس

ضمن میں شفق کی شاعری اپنے معاصر شعراء سے بہت اونچی اور بہت گہری نظر آتی ہے''۔ ۷

(۲) شفق سوپوری کے ناول ''نیلیما'' کے حوالے سے

''شفق سوپوری بے شک ایک اہم ترین شاعر ہیں لیکن شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک محقق، نقّاد، کالم نویس، فیچر نگار اور طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ یعنی شفق سوپوری ایک ہمہ جہت تخلیقی فنکار ہیں جن کا قلم شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں یکساں طور پر کمال خوبیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ اور اب یہ ناول لکھ کر وہ اُردو کے فکشن نگاروں کی صف میں بھی شامل ہو گئے۔

شفق سوپوری کا یہ ناول اردو کا پہلا ناول ہے جس میں آدی واسی عورتوں کے جنسی استحصال کو آدی واسی سماج اور تہذیب کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

اس ناول کی بُنت بڑی گہرائی اور مہارت کے ساتھ کی گئی ہے۔ ناول کا پلاٹ بہت جامع اور چست ہے۔ ناول کے کرداروں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے، واقعات کے بیان میں تسلسل ہے، لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس ناول میں شفق نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اپنے آپ میں ایک انوکھی مثال ہے۔ جگہ جگہ دیہی اور قصباتی تہذیب،

گاؤں کی سماجی وثقافتی روایات اور ہندو دیومالا کے حوالے
سے ایسے الفاظ اور تراکیب استعمال کئے گئے ہیں جن کا کوئی
بدل نہیں ہوسکتا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شفق سوپوری نے
بڑی محنت ومشقت کے ساتھ اس ناول میں ''ہر سخن موقع و ہر
نقطہ مقام دارد'' پر عمل کیا ہے۔ آدی واسی سماج میں مروج ایسے
ایسے مہاورات، ضرب المثل اور تراکیب کو برتا ہے جو کم از کم
اُردو میں کسی اور ناول نگار کے یہاں نظر نہیں آتا،،۔ ۸

(۶) پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر عتیق اللہ معاصر ادبی منظر نامے میں ایک انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شعر وسخن، تنقید اور تحقیق میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ بطور شاعر اُن کا نام جدیدیت سے تعلق رکھنے والے اُن معدودے چند شعراء میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے بالخصوص اردو غزل کو نئے رجحانات سے ہمکنار کر کے اس کے کھوئے ہوئے مقام کی بازیافت کے عمل میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ نئی غزل کو ایک مستحکم فکری، لسانی اور جمالیاتی بنیاد عطا کرنے والے شعراء میں عتیق اللہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید میں بھی اپنی بے پناہ ادبی اور علمی صلاحیتوں سے نئے چراغ روشن کئے۔ اُن کی تنقید فکری، نظریاتی اور تجزیاتی بنیادوں پر جدید فکری رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''شفق سوپوری کو میں پندرہ بیس برسوں سے جانتا ہوں۔ بیس

برس ادھر جب وہ نوجوان تھے ان کی غزلیں سن کر میں حیرت میں پڑ گیا تھا۔ حیرت میں اس لیے کہ یہ ہمارے وجدان کو حرکت میں لانے اور اپنے محسوسات میں شریک کرنے کی قوت سے بہرہ ور تھیں۔ یہ شفق کے اسلوب شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ فوراً ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے جیسے باطن کے گہرے نور آگہیں اندھیروں کو چھیر کر کوئی آواز نکلی ہے۔ یہ آواز یک دم تنہائیوں میں گم نہیں ہو جاتی بلکہ تادیر ہمارا پیچھا کرتی ہے۔ ہمیں اپنے چاروں طرف تادیر اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ میں اسے شفق کی غزل کا جادو ہی کہوں گا جس کا اثر بہت دیر اور بہت دور تک برقرار رہتا ہے۔ شفق کو خدا نے غیر معمولی تخلیقی سعادت بخشی ہے، بالخصوص اس طور کی غزلوں سے ہمیں کم ہی سابقہ پڑتا ہے۔ بحیثیت یہ بصیرت، لفظوں کے جماؤ کا یہ سلیقہ نئے شعراء میں جیسے بہت کم نظر آتا ہے۔ اگر انہوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ غزل سے اپنا تعلق برقرار رکھا اور مسلسل شعر گوئی کی طرف مائل رہے تو انہیں اُردو غزل کے جدید منظر نامے پر چھا جانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہمیں ان غزلوں میں اپنی طمانیت کا جو سامان ملا ہے وہ بڑا بیش قیمت بلکہ انمول ہے''۔۹

(۷) پروفیسر سیّد امین اشرف

پروفیسر سیّد امین اشرف اردو زبان کے ایسے شعراء میں شمار ے ہوتے ہیں جنہوں نے اُردو غزل کو کئی ناگوار عناصر سے پاک وصاف کیا۔ دراصل جدیدیت کے زیر اثر غزل میں فکری اور لسانی سطح پر کچھ ایسی چیزیں در آئی تھیں جو مستقبل میں کئی مسائل کی وجہ بن سکتی تھیں۔ چنانچہ امین اشرف نے اپنے منفرد انداز بیان، گہرے لسانی شعور اور مہذب فکری رویّے سے اردو غزل کو شعریت کے عناصر سے معمور کر دیا۔ بقول شمس الرحمان فاروقی ''سید امین اشرف کی غزل کو کسی ایک چوکھٹے، یا دو چار چوکھٹوں میں ڈال کر دیکھنا اپنا ہی منہ چڑانا ہے''۔ اُن کے اسلوب بیان میں اگر چہ فارسی الفاظ اور تراکیب کا بہت عمل دخل ہے تاہم اُن کی شاعری ترسیلی بنیادوں پر قاری کے ساتھ اپنا جذباتی رشتہ جوڑتی نظر آتی ہے۔ ایک کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہترین نقاد بھی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو فکشن کے سرمائے میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''شفق کی شاعری سے جو پہلا تاثر ہمارے ذہن پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا کلام روایت اور جدت کا بے حد خوبصورت امتزاج ہے۔ شفق اپنی شعری روایت سے واقف ہیں اور اس روایت کا عرفان انہیں تجربات کا حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ یہ تجربات اپنا تخلیقی جواز غزل کی روایت سے حاصل کرتے ہیں۔ شفق نہ روایت پرستی کی حد تک روایت سے منسلک ہیں اور نہ جدت پسندی کے جوش میں غزل کی مسلمہ

روایت کو یکسر منہدم کرنے پر آمادہ۔ وہ خارجی زندگی کے غیر موافق حالات اور ان سے پیدا شدہ اپنے ردِعمل کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ایسا کلاسیکی رچاؤ جو ہمعصر زندگی سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے۔ شفق کے یہاں اپنے عہد کی سفاک حقیقتوں سے شعری معاملہ صرف برائے بیت نہیں ہے بلکہ ان کا تخلیقی عمل اقتضائے باطن کے طور پر معرض وجود میں آتا ہے اور وہ شدید داخلی تقاضوں سے مجبور ہو کر شعر کہتے ہیں۔ شعر کہنا ان کے لیے کوئی میکانکی عمل نہیں بلکہ اپنے مضطرب باطن سے مکالمہ قائم کرنے کا وسیلہ ہے۔ زندگی کی فنا پذیری میں ثبات اور دوام کے امکانات کی تلاش کا عمل اور حالات کے دئے ہوئے زخموں کے اندمالی کا ذریعہ-------شفق سوپوری کے یہاں پائی جانے والی تخلیقی توانائی کا سرچشمہ ان کا حساس باطن ہے جو حالات کی نامساعدت اور زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہونے کے بعد اپنے ردِعمل کو شعر کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیتا ہے۔ اور اس طرح شفق کی غزل اس کے پُرآشوب عہد کا تخلیقی دستاویز بنتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر خاطر نشان رہنا چاہیے کہ شفق نے عصری حسیت کے نام پر تنہائی فرد کی بے چارگی، لایعنیت اور گمشدگی جیسے موضوعات کو محض فیشن کے طور پر

نہیں برتا بلکہ ذات کے حصار کو عبور کر کے اپنے عہد کی روح
فرسا حقیقتوں سے آنکھیں چار کیں اور ان پر فکر و فن کی بنیاد
رکھیں۔ چونکہ شفق نے انسانی مستقبل کے قتل کا مشاہدہ براہ
راست کیا ہے، لہٰذا ان کا کرب کچھ مواقع پر احتجاج اور
واشگاف طنز کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مگر احتجاج اور طنز
کی یہ بیشتر معاصر شعراء کی طرح راست بیانی اور برہنہ گفتاری
کی آئینہ دار ہو کر دست فن پر آنچ نہیں آنے دیتی''۔ ۱۰

(۸) کرشن کمار طور

کرشن کمار طور جدیدیت سے تعلق رکھنے والے اُن شعراء کی صف میں ممتاز مقام رکھتے ہیں جنہوں نے لسانی اور فکری اعتبار سے اردو غزل کو نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔ کرشن کمار طور نے لسانی سطح پر بعض ایسے اجتہادات سے کام لیا جن سے اردو غزل جدید ترین فکری اور اسلوبیاتی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہوئی۔ کرشن کمار طور کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ایک طویل مدت سے ''سرسبز'' نام کے رسالے کو تن تنہا جاری رکھے ہوئے اُردو زبان و ادب کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ معیاری تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ طورؔ نے کئی اہم موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھ کر اپنی گہری تنقیدی صلاحیت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''شفق سوپوری کا شعری تخلیقی اظہار ان کی لسانی قوت سے
مظہر ہے، جس کی چھوٹ دور دور تک ان کے باطنی سفر میں پانی

میں چراغ جلانے کی مترادف ہے۔ وہ فنافی الشعر ہی نہیں بلکہ فنافی الذات کا پرتو ہی نہیں بلکہ حیات کے افہام وتفہیم کی اثباتی منزل کا سراغ بھی دیتی ہے اور جذب کے وسیلے سے عرفان کے لالہ زار میں خوشبو بیز کے مماثل ہے، ان کی باطنی شاعری نفی کے ظاہری نظام میں ابھی تک گل ریز ہے۔ شفق سوپوری اپنے لفظ، خیال، اسلوب اور معنی سے شعر کو ایک ایسی قلبی واردات بنادیتے ہیں جہاں ان کی تخلیقیت آفرینی امتیازی خصوصیت سے متصف ہے۔ وہ استعارہ نہیں بلکہ شعور سے اپنی شعری عناصر کو ترتیب دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پڑھنے والا ان کی ذہنی سطح سے کبھی اذکار نہیں ہونے پاتا۔ ان کے اور ان کے قاری کے درمیان ایک غیر مرئی تعلق ہمیشہ استوار رہتا ہے اور ان کے تخلیقی اشتراک کی دانش سے منور ابلاغ، ترسیل اور محاکات ان کا لازمۂ شعر میں اور ان کی غنائیات کا اعتبار اور وجود بھی''۔ ۱۱

(۹) ڈاکٹر سیفی سرونجی

ڈاکٹر سیفی سرونجی کی ادبی خدمات سے ساری دنیا واقف ہے۔ وہ ایک انفرادی لب ولہجہ رکھنے والے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے نقاد بھی ہیں۔ جدید ادبی منظرنامے میں اُن کی تنقید کو نہایت ہی موقر مانا جاتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے

دبستانوں پر پہلی بار تحقیق کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ شاعری اور فکشن کے فنی لوازمات سے پوری طرح سے واقف ہیں۔ علاوہ ازیں اُن کی نظر عالم گیر ادبی منظر نامے پر بھی ہے۔ چنانچہ وہ شاعری اور فکشن کی تنقید کرتے وقت روایت اور جدت کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اُن کی ادارت میں عالم گیر شہرت یافتہ رسالہ ''سہ ماہی انتساب عالمی'' (سرونج) ایک مدت سے جاری ہے۔ اس رسالے کی مدد سے وہ اردو زبان و ادب کی بے پناہ خدمت کر رہے ہیں۔ سیفی سرونجی شفق سوپوری کی ایک معرکۃ الآراء کتاب ''اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

> ''ڈاکٹر شفق سوپوری بحیثیت شاعر، محتاجِ تعارف نہیں کہ وہ اپنی پہچان ایک اچھے معتبر شاعر کے روپ میں برسوں پہلے قائم کر چکے ہیں۔ لیکن شاعری کے علاوہ اُنہیں زبان و بیان اور علم عروض سے لے کر فن موسیقی پر بھی عبور حاصل ہے اور اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ موسیقی میں مہارت رکھنے کی وجہ سے وہ غزل کے مزاج کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ زبان کی باریکیاں اور اس کی نازک فنی خوبیوں سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ اس موضوع پر برسوں لکھتے بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر شفق سوپوری نے اس کتاب میں اردو غزل اور موسیقی کے ذریعے سے ہندوستانی موسیقی پر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔ اس لیے کہ راگ راگنی ہندوستانی تہذیب کی دین ہیں۔ ڈاکٹر شفق

سو پوری کا اس کتاب میں سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ
انہوں نے اردو غزل اور موسیقی کے حوالے سے ہندوستانی
موسیقی کو اجاگر کیا ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا
ہے۔ یہ ایک بڑے اور سچے محقق ہونے کا ثبوت ہے کہ اُس
نے اپنے وطن عزیز کی تہذیب کو اعلیٰ سطح اور اعلیٰ پیمانے پر
اپنے گہرے مطالعے اور مشاہدے کے ذریعے نمایاں کیا۔
جس موضوع کو چھونے کی بھی لوگ جرأت نہیں کرتے اُس
موضوع پر شفق سو پوری نے اتنا کچھ لکھا کہ ادب کی
تاریخ میں وہ ہمیشہ اس حوالے سے زندہ رہیں گے''۔ ۱۲

(۱۰) جاوید انور

جاوید انور اُردو کے جوانوں سال شاعروں اور نقادوں میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ اُن کے تنقیدی مطالعے نہایت سنجیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں اور اُنہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ معاصر ادبی منظر نامے پر نہایت گہری نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی ادارت میں ''وارانسی'' سے ایک رسالہ ''تحریک ادب'' شائع ہو رہا ہے جس کے ذریعے سے نہ صرف بزرگ ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں سے دنیا کو روشناس کراتے ہیں بلکہ نوجوان اور نوخیز قلم کاروں کے کمالات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ جاوید انور شفق سو پوری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''شفق سو پوری کے اشعار فطرت اور انسان کے باہمی تعلق
کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جو ان کے مخصوص شعری

مزاج کو سمجھنے میں بھی معاون ہے۔اس سے آگے چلا جائے تو اُن کے شعری تجربے کے آئینے میں ان کی شخصیت کا انکشاف بھی کسی نہ کسی طور ہوتا ہے۔ان کے اشعار میں جو فضائی کیفیت ملتی ہے، وہ فطرت کے رابطوں کو رمزیت کے پیرائے میں پیش کرنے کے ان کے ہنر کو بخوبی نمایاں کرتی ہے۔شفق سوپوری نے سماجی مسائل کے بیان میں اپنے شعری مقاصد کو بھی ایک معینہ سمت دی ہے۔ان کے شعری مقاصد میں انسانوں کے مادی اور جسمانی وجود کی احاطہ بندی ہی نہیں ذہنی اور جذباتی مسئلوں کو اقتصادی رشتوں سے مربوط رکھنے کے باوجود اس سے آگے زاویۂ نظر کی وساطت کا پھیلاؤ ہے۔یہ ذہنی وساطت کبھی خوف کے مراحل سے گذرتی ہے تو کبھی مصنوعی سکون کے اندر پوشیدہ انتشار سے بھی آنکھیں چار کرتی ہے۔شفق سوپوری کے شعری پس منظر میں عصری آگہی کا بہت دخل ہے۔ان کے شعری مطالبات ان کی تخلیقی قوت کو اس طور متاثر کرتے ہیں کہ تہذیبی روایات اور اساطیر کے آئینے میں موجودہ عہد اور ذات و کائنات کے توازن کا سراغ لگانے کی جستجو کے تخلیقی عمل کا ایک ناگزیر حصہ محسوس ہوتی ہے۔انہوں نے تہذیب اور تاریخ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے سماج

کی تہذیبی اور روحانی توسیع کا ذریعہ تصور کیا ہے۔ شاعری کے توسط سے نئے جمالیاتی افقوں کی جستجو کا عمل زندگی کے موجود اور لاموجود کے معنوی انسلاک کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ان کے تخلیقی اظہار میں اپنے سماج اور معاشرے کا ایک نامعلوم کرب بھی موجود ہے، جس کی جڑیں صدیوں کی تاریخی تہوں میں اندر تک پھیلی ہوئی ہیں اس طرح ان کے اشعار معنویت کے اعتبار سے مختلف ہیں اور شدید اثر رکھتے ہیں۔ شفق سوپوری کی شعری کائنات کا رشتہ کسی معینہ نظریے یا عقیدے سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ طرز احساس کی تازہ کاری کے سبب ان کے اشعار فکر کی پختگی کے بھی بیشتر تقاضے پورے کرتے ہیں اور فنی تکمیل کے بیشتر تقاضوں کو بھی۔ وہ تاریخی واقعہ کو موضوع بنائیں یا ذاتی جذباتی واردات کو ٹھوس استعاروں اور نمایاں پیکروں کا انتخاب حسی اور نفسیاتی کوائف کی عکاسی بخوبی کرتا ہے۔ ان کے شعری تکمیلیت کا یہ راستہ جذبے کی تحلیل کے مراحل سے ہو کر گزرتا ہے۔ ان مراحل کی تشکیل میں حالات کی تبدیلی سے پیدا شدہ نئی حسیت کا نمایاں دخل ہے۔ انسانی زوال کا المیہ جو بعض عالمگیر شعوری ادراک کی گمراہی اور ناکامی سے عبارت ہے''۔ ۱۳

(۱۱) پروفیسر شہپر رسول

پروفیسر شہپر رسول جدید ادبی منظر نامے میں اپنا مقام بنا چکے ہیں اُن کی شاعرانہ خصوصیت کا اعتراف اردو کے لگ بھگ تمام مقتدر نقادوں نے کیا ہے۔ اُن کی شاعری کا ایک انفرادی رنگ ہے جو دور سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ ایک اچھے تنقید نگار بھی ہیں۔ شفق سوپوری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''شفق سوپوری بہت اچھے شاعر ہیں۔ کشمیر کے متوسط نسل کے نمائندہ شاعروں میں اُن کا نام اُن کے انفرادی لب و لہجہ کی وجہ سے اہم ہیں۔ شفق نے خاص طور سے کشمیر کے حُسن اور اس کے کلچر اور جغرافیائی تخصیص کے حوالے سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کشمیریت کی ترجمانی کی ہے۔ اس لیے مجھے اُن کی شاعری دوسرے لوگوں سے زیادہ پسند ہیں۔ شفق سوپوری جدیدیت کی بعد والی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ شفق سوپوری اپنی شاعری میں زبان کو بہت سلیقے سے استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ لفظ کا کردار کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ شفق سوپوری اُس وقت موجود ہماری نئی غزل کے نمائندہ شعراء میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں''۔ ۱۴

(۱۲) پروفیسر شہاب عنایت ملک

پروفیسر شہاب عنایت ملک ایک سلجھے ہوئے نقاد ہیں۔ انہوں نے شاعری اور فکشن کے حوالے سے کئی اہم جائزے لیے ہیں۔ قرۃ العین حیدر پر ان کی تحقیقی اور تنقیدی تصانیف اور فکشن کی تنقید میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ وہ شفق سوپوری کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

> ''شفق سوپوری کی شناخت غزل کی وجہ سے بنی ہوئی ہے اور موجودہ دور کی غزل کے منظر نامے میں اُن کا ایک اہم مقام بنتا ہے۔ اُن کی شاعری میں دور حاضر کے حالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ حُسن و عشق کا عنصر بھی کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی شاعری روایت اور جدت کی ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ اُن کی شاعری میں اگرچہ واضح طور پر کسی رجحان یا تحریک کے اثرات کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی ہے تاہم اس میں ترقی پسند خیالات بھی ہیں، جدیدیت کے عناصر بھی ہیں اور مابعد جدیدیت کے اثرات بھی ہیں لیکن یہ اثرات ان کی شاعری میں شعوری طور پر نہیں آئے ہیں بلکہ غیر شعوری طور پر۔ مجموعی طور پر شفق سوپوری اپنی شاعری میں ایک الگ روِش بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں''۔ ۱۵

(۱۳) پروفیسر شہزاد انجم

پروفیسر شہزاد انجم کا نام معاصر تنقید نگاروں میں کافی اہم ہے۔ انہوں نے فکشن کے حوالے سے کئی اہم جائزے لئے ہیں۔ اُن کی تنقید میں موضوع کے حوالے سے ایک منفرد التزام پایا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے ادبی منظرنامے پر اُن کی گہری نظر ہے وہ شفق سوپوری کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

> ''شفق سوپوری کا شاعر کی حیثیت سے جو مقام و مرتبہ ہے اس سے ہم سبھی واقف ہیں جدید اُردو غزل میں اُن کا نام اہم اور ممتاز ہے۔ شفق سوپوری کا اپنا ایک منفرد لہجہ ہے اور میں واضح طور پر بتا دیتا ہوں کہ کشمیر کے علاوہ وہ پورے ہندوستان میں مقبول اور مطلوب شاعر ہیں۔ دیگر خصوصیات کے علاوہ اُن کی شاعری کا ایک خاص امتیاز مقامی رنگ ہے۔ شفق سوپوری کی دنیا جدا ہے انہوں نے اپنی شاعری میں اپنی دنیا کو بسایا ہے۔ اپنی دنیا کو بسانے سے وہ کہیں نہ کہیں اپنے مسائل، معاملات، کرب، درد، پریشانیوں، الجھنوں اور انتشار کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے درد و کرب کو بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ شفق سوپوری ہمارے دور کے ایک ممتاز منفرد اور اہم شاعر ہیں۔ اُن کا ایک اپنا لب و لہجہ ہے جو سب سے الگ ہے''۔ ۱۶

(۱۴) ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی

ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی ایک شاعر اور ایک نقاد کی حیثیت سے اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہیں۔ اُن کی شاعری جدیدیت سے لے کر مابعد جدیدیت تک کے رجحانات کے تقاضوں پر پورا اُترتی ہے۔ اُن کے کلام کی خصوصیات پر اردو کے جید نقادوں نے لکھا ہے۔ وہ اپنی تنقیدی کاشوں سے اردو کے ممتاز نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''شفق سوپوری کی شاعری بالکل منفرد شاعری ہے۔ اُن کے اوپر کسی شاعر، کسی تحریک یا کسی رجحان کا اثر نہیں ہے۔ اس کے باوجود اُن کی شاعری اپنی روایت سے وابستہ ہے اور روایت کی اس وابستگی کی وجہ سے اس شاعری کے اندر کسی رجحان یا کسی اِزم کی نشاندہی ضرور کی جاسکتی ہے۔ شفق سوپوری غزل کے بہت اچھے شاعر ہیں اُن کی شاعری بالکل Independent شاعری ہے۔ آج کی شاعری ہے بالکل منفرد شاعری ہے۔ لب ولہجہ کے اعتبار سے جو راستہ شفق سوپوری نے تلاش کیا ہے۔ وہ اُن کی شاعری کو ایک امتیازی مقام عطا کرتا ہے لہٰذا اُن کی شاعری کو پڑھ کر کسی دوسرے شاعر کی یاد نہیں آتی بلکہ شفق سوپوری ہی یاد آتے ہیں۔ شفق کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ مابعد جدید دور کی شاعری ہے جس کے اندر صارفیت اور اخلاقی اقدار کے

تنزل جیسے موضوعات کے علاوہ عشق کے حوالے سے نئے مضامین ایک خاص رنگ سے موجود ہیں۔ مقامی رنگ کے حوالے سے شفق سوپوری کے پاس کوئی فارمولہ نہیں ہے وہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں، کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے کشمیر کا رنگ ہے۔ کشمیر کا جو حُسن ہے وہ اُن کی شاعری کے اندر موجود ہے یہی اُن کی خوبی ہے اور یہی اُن کی شاعری کی طاقت بھی ہے۔ شفق کے یہاں کشمیر کے سیاسی حالات کا اظہار دبے الفاظ میں، مدھم سروں میں، استعاروں کے اندر اور خاص علامتوں کے اندر ملتا ہے۔ اپنی خصوصیات کی بنا پر اپنے عصر کے شعراء سے بہت الگ ہیں اُن کی شاعری بڑی شاعری ہے۔ شفق سوپوری کی شاعری اپنے ہمعصر شعراء سے بہت الگ ہے، بہت مختلف ہے، منفرد ہے اس لیے جب شفق سوپوری کو پڑھتے ہیں تو شفق سوپوری ہی یاد آتے ہیں۔ حامدی کاشمیری یا فرید پربتی نہیں۔ شفق اپنی نسل کے سب شعراء میں ممتاز ہیں۔ ان کے مقابلے میں کوئی دوسرا شاعر نہیں۔ میں بڑی ذمہ داری سے یہ باتیں کہہ رہا ہوں''۔ ۱۷

(۱۵) ڈاکٹر سراج اجملی

ڈاکٹر سراج اجملی ایک ممتاز اور منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ کار

نقاد اور محقق بھی ہیں۔نئی غزل کے منظر نامے میں اُن کی شاعری اپنے منفرد پیرائیہ اظہار کی وجہ سے ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔وہ ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں اپنے نظریات یوں پیش کرتے ہیں:

''شفق سوپوری نے جس زمانے میں شاعری کا آغاز کیا اُس زمانے میں جواد بی تحریکات یا رجحانات کا سلسلہ ہمارے یہاں تھا۔اُن میں سے سب سے غالب اور قوی رجحان جدیدیت کا رجحان تھا اور جدیدیت سے متاثر ہوئے بغیر جدید خیالات کو اپنے اظہار کے پیرائے میں لائے بغیر اور کچھ ممکن نہیں تھا لیکن جدیدیت میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو روایت کے محترم اور صالح عناصر کو تجربہ بنا کر جدید پیرائیہ اظہار کو اپنا رہے تھے۔ان میں شفق سوپوری کا نام بھی شامل ہے۔شفق نے جدید شاعر کی حیثیت سے بھی اپنا ایک الگ مقام بنایا جس کا اعتراف جدیدیت سے وابستہ ناقدین نے بھی کیا ہے۔اس کی بین مثال شمس الرحمان فاروقی صاحب کا شفق سوپوری کو''شب خون'' میں بار بار شائع کرنا ہے''۔۱۸

(۱۶)رفیق راز

رفیق راز موجودہ دور کے رجحان ساز شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔آپ کی شاعری جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے اندر تصوف اور اسراریت کے عناصر

سموئے ہوئے ہیں۔آپ ایک طویل مدت تک ''شب خون'' میں چھپتے رہے اور آپ کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف وسیع پیمانے پر کیا گیا ہے۔آپ ایک باشعور نقاد بھی ہیں۔آپ شفق سوپوری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''شفق سوپوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔شاعری میں ان کا مزاج رومانوی بھی ہے اور رومانی بھی۔اردو ادب میں اگرچہ بہت سے شعراء شاعری کر رہے ہیں لیکن وزنِ شعر اور عروض سے بہت کم شعراء واقف ہیں۔شفق سوپوری اوزان اور عروض سے کمال درجہ واقفیت رکھتے ہیں۔شفق سوپوری اپنے کلام میں سوچ سمجھ کر الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ان کی شاعری فضول الفاظ سے پاک ہے۔چھوٹی چھوٹی بحروں میں شعر کہتے ہیں۔وہ اپنے اشعار میں اگرچہ لفظ کم استعمال کرتے ہیں لیکن معنی کی تہہ داری ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔عام قاری بھی ان کے کلام سے مستفید ہو جاتا ہے۔ان کی شاعری نہ زیادہ مبہم اور نہ زیادہ پیچیدہ ہے۔صاف سترہ شعر کہتے ہیں اور اس میں وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے۔ان کی شاعری کسی رجحان یا میلان سے وابستہ نہیں اور نہ ہی وہ کسی تحریک سے وابستہ ہے وہ اپنی الگ راہ بنائے ہوئے ہیں لیکن کسی حد تک وہ مابعد جدیدیت کے زمرے میں وہ شاعری کرتے ہیں اور فنی اعتبار سے ان کی شاعری اعلیٰ درجہ کی

شاعری ہے اور شعر کے باریک سے باریک نکتوں پر کامل
دسترس رکھتے ہیں''۔۱۹

(۱۷) ڈاکٹر نذیر آزاد

ڈاکٹر نذیر آزاد ایک اہم شاعر اور نقاد ہیں۔آپ کی شاعری روایت اور جدت کا ایک دلکش سنگم ہے۔آپ نے تحقیق اور تنقید کے میدان میں نہایت وقیع کارنامے انجام دیئے ہیں۔اردو میں لغت نگاری کے حوالے سے اُن کا تحقیقی کارنامہ نہایت اہم ہے۔آپ ڈاکٹر شفق سوپوری کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

''شفق سوپوری اُردو، فارسی تنقیدی روایت کا گہرا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ نئے تنقیدی نظریات پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہیں۔نتیجے کے طور پر انہوں نے لسانی اور جمالیاتی تناظر میں اردو شعری روایات کو پرکھنے کی ایک مستحسن کوشش کی ہے۔شفق کی ایک اور قابل تحسین خوبی یہ ہے کہ انہیں ہندوستانی فنِ موسیقی پر عبور حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی کے درمیان اشتراکات اور انسلاکات کو منظر عام پر ان میں زبردست عرق ریزی سے کام لیا ہے۔غزل کی فارسی روایت کو ہندوستانی کلاسیکی موسیقی نے کس طرح اپنے اندر جذب کیا اور کس طرح متضادات سے ایک نئی جمالیات پیدا ہوگئی۔اس کا تجزیہ کرنے کا صحرا شفق کے سر جاتا ہے''۔۲۰

حواشی

۱: دشت میں دور کہیں، شفق سوپوری، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۷ء

۲: اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۱۱ء

۳: سہہ ماہی ''سیاق'' جموں شمارہ نمبر ۲

۴: ایک غیر مطبوعہ تحریر سے ماخوذ

۵: دلِ خاک بسر، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۸۹ء

۶: ایک شخصی انٹرویو، از حامدی کاشمیری، ۱۵ نومبر ۲۰۱۵ء بمقام سری نگر

۷: سہہ ماہی ''سیاق'' جموں، شمارہ نمبر ۲

۸: ''نیلیما'' از ڈاکٹر شفق سوپوری،، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۱۶ء

۹: ایک غیر مطبوعہ تحریر سے ماخوذ

۱۰: دشت میں دور کہیں، شفق سوپوری، مہدی پبلیکیشنز عشہ پیر سوپور، ۲۰۰۷ء

۱۱: ایضاً

۱۲: سہہ ماہی ''انتساب عالمی'' سرونج

۱۳: وادی کشمیر کے چند اہم شعراء از جاوید انور، ہمالین ایجوکیشنل مشن سوسائٹی راجوری، ۲۰۱۲ء

۱۴: ایک شخصی انٹرویو، از پروفیسر شہپر رسول، بتاریخ ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء

۱۵: پروفیسر شہاب عنایت ملک سے نجی گفتگو، بتاریخ ۱۳ اگست ۲۰۱۵ء

۱۶: ایک شخصی انٹرویو، از پروفیسر شہزاد انجم، بتاریخ ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء

۱۷: شخصی انٹرویواز ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، بتاریخ ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقامِ علی گڈھ

۱۸: شخصی انٹرویواز ڈاکٹر سراج اجملی، بتاریخ ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقامِ علی گڈھ

۱۹: شخصی انٹرویواز رفیق راز، بتاریخ ۸ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقامِ سرینگر کشمیر

۲۰: شخصی انٹرویواز ڈاکٹر نذیر آزاد، بتاریخ ۲۰ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقامِ سرینگر کشمیر

اختتامیہ

شفق سوپوری کا شمار ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والی معتبر، مستند اور موقر ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کے شعری اور نثری کارنامے اس قدر وسیع اور وقیع ہیں کہ ان کا ڈنکا نہ صرف ہند و پاک بلکہ پوری دنیا میں بج رہا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اردو کی معاصر ادبی شخصیات میں نمایاں مقام اور حیثیت کے حامل ہیں۔

شفق سوپوری کا جنم وادیٔ کشمیر کے ایک معروف قصبہ سوپور میں ہوا ہے۔ ان کے والد پیر مریدی کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کی معاشی اور مالی حالات غیر مستحکم تھے۔ مگر شفق سوپوری نے نہایت ہی نامساعد حالات میں نہ صرف تعلیم جاری رکھی بلکہ اپنے ادبی اور علمی صلاحیتوں کو بھی بُجھنے نہ دیا۔

شفق سوپوری کا بچپن مفلسی میں گزرا ہے، بی۔ اے تک انھوں نے سوپور میں ہی تعلیم حاصل کی جب کہ ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کشمیر یونی ورسٹی کے شعبہ اردو سے حاصل کی۔ شفق سوپوری کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ آٹھویں جماعت میں پہلا شعر کہنے والے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اس شاعر نے ابتدائی منازل طے کر کے اپنی تخلیقات کے لیے اردو کے معروف اور مقبول ادبی رسالے ''شب خون'' الہ آباد میں جگہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

شفق سوپوری نے نوکری کی ابتدا سوپور کے ایک نجی اسکول سے نہایت قلیل مشاہرے پر کی۔ یہ نوکری انھوں نے چھوڑ کر دہلی کی ایک ٹراول ایجنسی میں کام کرنے کی غرض سے پہلی بار ۱۹۸۶ء میں دہلی کا سفر کیا۔ دہلی میں دل نہ لگا تو واپس کشمیر آ کر مختلف کالجوں میں عارضی بنیادوں پر نوکری کی تاوقتیکہ ۱۹۹۳ء

میں ان کا تقرر کالج میں بطور لکچرار ہو گیا۔ وہ اس وقت اسوسیئٹ پروفیسر کے طور پر محکمہ اعلیٰ تعلیم میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں۔

شفق سوپوری کی ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار ہے۔ ان کی بیگم ریحانہ اختر خود ایک قلم کار ہیں۔ ان کا اکلوتا بیٹا سید محمد سبزان خطائی فی الوقت سری نگر کے ایک معروف پبلیک اسکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم ہے۔

شفق سوپوری کا مجموعہ کلام ''دلِ خاک بسر'' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کی اشاعت نے ان کی شہرت کی بنیاد ڈال دی۔ اردو کے سربرآوردہ نقادوں نے اس پر نہایت حوصلہ افزا تبصرے کیے اور جگہ جگہ پر اس کے شعر بطور حوالہ پیش کیے ۱۹۹۲ء میں سوپوری کے گیتوں کا مجموعہ ''بیتے موسموں کے دکھ'' منظر عام پر آیا۔ اس میں شامل نظموں اور گیتوں میں میراں جی اور ابن انشاء کا اثر صاف دیکھائی دیتا ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ان کا دوسرا مجموعہ غزلیات ''دشت میں دور کہیں'' چھپ کر آیا اس مجموعہ کی غزلوں کا انتخاب شمس الرحمان فاروقی نے کیا ہے، اس مختصر مجموعے پر شفق سوپوری کو ریاسی کلچرل اکیڈمی سے اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان کا کلام برصغیر کے موقر اور معیاری جرائد میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ تحقیق و تنقیدی موضوعات پر شفق سوپوری نے مندرجہ ذیل تصانیف تصنیف کی ہیں۔

۱۔ موسیقی شاعری اور لسانیات

۲۔ مخزن موسیقی

۳۔ اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی

۴۔ جہات

۵۔ کلام فیض کا عروضی مطالعہ

۶۔ غ۔م۔ طاؤس فن اور شخصیت

اس کے علاوہ انھوں نے حال ہی میں ایک ناول ''نیلیما'' بھی تصنیف کیا ہے۔اس وقت ان کی فکاہیہ تحریروں کا مجموعہ،شگفتا نے،زیرِ اشاعت ہے۔

ڈاکٹر شفق سوپوری کی شخصیت میں ذہانت وفراست،علمی شوق وادبی ذوق،مہمان نوازی،فراخ دلی،حق گوئی وبے باکی اورطرز فکر جیسی ساری صفات شامل ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں جہاں ان انفرادی خصوصیات اور رجحانات کا اہم کردار ہیں وہیں مذہبی،ثقافتی اور سماجی محرکات نے ان کی شخصیت بنانے میں اپنا اہم رول ادا کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی شخصیت میں ان کا ذاتی اور خاندانی پس منظر بھی اہمیت رکھتا ہے۔شفق سوپوری کی ظاہری اور باطنی شخصیت پر ان کے شاعرانہ مزاج کا گہرا پرتو دکھائی دیتا ہے۔واردات قلبی سے لے کر معاملات زیست تک وہ اپنے شاعرانہ طور اور انداز سے سروکار رکھتے ہیں۔ان کے سینے میں ایک حساس دل دھڑک رہا ہے۔چنانچہ جذبات واحساسات کے تموج سے ان کی ذات وشخصیت میں اضطراب اور بے باکی کا عنصر پیدا ہوگیا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد جموں وکشمیر میں اردو شعرا کی جو نسل سامنے آئی ان میں شفق سوپوری کا نام اس وجہ سے اہم ہے کہ انھوں نے اردو غزل کی شعریات ورسومیات سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے عصری حسیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ فن کی سطح پر کئی اجتہادات کر کے اپنے شعری منصب کا پورا حق ادا کیا۔اگرچہ بعض نقاد شفق کی شاعری کو جدیدیت کے دور کی پیداوار مانتے ہیں اور بعض کا کہنا یہ ہے کہ شفق کی شاعری مابعد جدیدیت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے،مگر حقیقت یہ ہے کہ شفق سوپوری کی شاعری کو فنی یا فکری سطح پر کسی خاص رجحان یا تحریک سے وابستہ کرنا ایک غیر منصفانہ عمل ہوگا جس کی تصدیق پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر امین اشرف، پروفیسر قدوس جاوید، جاوید انور،شمس الرحمان فاروقی،کرشن کمار طور، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ جیسے نقادوں نے کی ہے۔

مجموعی طور کہا جاسکتا ہے کہ شفق سوپوری نے روایت سے اکتساب کر کے خود کو روایت زدہ ہونے سے

بچایا ہے اور محض جدت پسندی کے تحت اپنی شاعری کو چستان نہ ہونے دیا۔ شفق اپنی غزلوں کے لیے نہایت مترنم بحروں کا انتخاب کرتے ہیں اور زبان و بیان کے دروبست سے صحرا میں پھول کھلانے کا عمل ممکن بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں گہرے لسانی شعور کی نشان دہی ان کی شاعری میں استعمال ہونے والی لفظیات، علامتوں، استعاروں اور تشبیہات سے بآسانی ہوسکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ شفق سوپوری اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اگرچہ شاعری لفظوں کی ایسی خوش آہنگ ترتیب و تنظیم کا نام ہے جس کی تہہ میں تجرباتی زندگی سے وابستہ انسانی جذبات و احساسات کے لطیف ارتعاشات موجزن ہوتے ہیں لیکن لفظوں کی یہ ترتیب و تنظیم کوئی آسان عمل نہیں۔ شفق سوپوری کو لسانی ترتیب کاری میں ایک عرصے تک خونِ جگر صرف کرنا پڑا اور وہ اب اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں کہا جا سکتا ہے کہ وہ منزل مقصود و مطلوب سے ہمکنار ہو گئے ہیں۔

کلام شفق کی ایک اور خصوصیت ترکیب سازی ہے۔ شفق سوپوری نے اس سلسلے میں اپنے اختراعی ذہن کو بروئے کار لا کر نہایت نادر قسم کی تراکیب تخلیق کی ہیں۔ شفق سوپوری کی غزلوں کی لسانی ساخت اور معنیاتی نظام اس قدر وسیع ہے کہ ان کے اشعار کی مختلف جہات کا جائزہ لیے بغیر مکمل تجزیہ کرنا ناممکن ہے اس سلسلے میں ان کی پیکر طرازی اور علامت سازی کا تجزیہ کر کے ان کی شعری جمالیات کے نئے گوشوں کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔

شفق سوپوری ایک کامیاب غزل گو شاعر ہونے ساتھ ساتھ ایک منفرد نغمہ نگار بھی ہیں۔ ان کے گیتوں اور نظموں کا مجموعہ ''بیتے موسموں کے دکھ'' اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں جو بیان کا رچاؤ اور زبان کا رکھ رکھاؤ ہے، وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اگر شفق سوپوری مستقل طور پر گیت لکھتے تو وہ اپنے عہد کے سب سے منفرد اور ممتاز نغمہ نگار ہوتے۔ ان کی نظموں اور گیتوں میں لسانی اور ہیئتی سطح پر کئی تجربات کے عمل دخل کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ اس عمل سے شفق سوپوری نے نہ صرف قدیم ہندوستانی گیتوں کی روایت کا

احیاء کیا ہے بلکہ بعض فنی اجتہادات سے نظموں کو گیت سے قریب تر کر دیا ہے اور گیتوں کا رشتہ زمین سے جوڑ دیا ہے۔

شفق سوپوری ایک منجھے ہوئے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ طرز نقاد اور محقق بھی ہیں ۔انھوں نے یوں تو تحقیق وتنقید میں کئی اہم اور قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں لیکن ان کی نثری تصنیف ''اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی'' نے انھیں اردو کے اعلیٰ ادبی حلقوں میں شہرت دوام عطا کی۔اردو میں یہ اپنے موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے۔شفق نے تحقیق وتنقید میں نادر موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔جس کی مثال ان کی ایک اور تصنیف ''موسیقی شاعری اور لسانیات'' ہے۔جس میں انھوں نے موسیقی ،جمالیات،شاعری اور لسانیات جیسے اہم نازک اور نادر موضوعات پر تحقیق کی ہے۔اس موضوع پر ان کی ایک اور تصنیف ''مخزن موسیقی'' ہے۔ان کی کتاب اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی کے موضوع کے اختصاص کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر شمس الرحمان فاروقی نے دیباچہ تحریر کیا۔ فاروقی خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''ہمارے نوجوانوں میں شفق سوپوری تنہا ہیں جو ان موضوعات پر غور وخوض کرتے ہیں۔ان کی ایک کتاب موسیقی،شاعری اور لسانیات کچھ دن پہلے شائع ہوئی تھی وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئی''۔

شفق سوپوری کے تحقیقی کارناموں میں ایک اہم کارنامہ ان کی کتاب ''غ۔م۔طاؤس فن اور شخصیت'' ہے جس میں انھوں نے نہایت عرق ریزی سے اپنے موضوع سے تعلق رکھنے والے تمام حوالوں سے اکتساب کر کے طاؤس کی حیات اور ادبی شخصیت کے گم شدہ گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔'' کلام فیض کا عروضی مطالعہ''شفق سوپوری کی بے حد اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے فیض احمد فیض کے جملہ کلام کا عروضی مطالعہ کر کے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شفق نہ صرف شاعری کے باریک نقطوں سے واقف ہیں بلکہ موسیقی کے ساتھ ساتھ علم عروض کی

باریکیوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔شفق سوپوری نے اس کتاب میں محض عروضی مطالعہ پر ہی اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ بعض موقعوں پر کسی اہم نقطے پر بھرپور بحث کر کے کسی طرح کے اشکال کو دور کرنے کی سعی بھی کی ہے۔اس دوران انھوں نے بحروں کے تفاعل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

''جہات''، شفق سوپوری کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کی تخصیص یہ ہے کہ اس کے بیشتر موضوعات کا تعلق جموں وکشمیر کی شعریات سے ہے۔اس میں پرتپال سنگھ بیتاب، ہمدم کاشمیری اور رفیق راز جیسے اہم معاصرین پر شفق سوپوری کے لکھے ہوئے تنقیدی نوعیت کے مضامین شامل ہے۔یہ کتاب پڑھ کر شفق سوپوری کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

''نیلیما''، شفق سوپوری کا پہلا ناول ہے۔جو ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔پروفیسر قدوس جاوید کا کہنا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا ناول ہے۔اس ناول میں شفق سوپوری نے آدی واسی لڑکی کی درد بھری کہانی بیان کی ہے۔جسے اپنے معاشرے میں کئی طرح کی مصیبتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔شفق سوپوری کا یہ ناول اردو میں لکھی گئی تانیثی ناولوں کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے۔اس ناول میں آدی واسی عورتوں کے پردے میں دنیا کے طول وعرض میں مردوں کی بالادستی کی شکار عورتوں کی الم ناک انجام کی ترجمانی کی گئی ہے۔فنی لوازمات کے اعتبار سے یہ ناول ہر طرح سے کامیاب نظر آرہا ہے اور ان دنوں اردو کے اعلیٰ ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ پلاٹ ہو یا کردار، زبان و بیان ہو یا مکالمہ نگاری، جزیات نگاری ہو یا منظر کشی شفق سوپوری ہر مقام پر کامیاب نظر آتے ہیں۔

''شکفتانے''، شفق سوپوری کی فکاہیہ تحریروں کا مجموعہ ہے جو اس وقت طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔اس میں مصنف نے کچھ عنوانات کے تحت اپنا سوانحی خاکہ بھی پیش کیا ہے۔یہ کتاب پڑھ کر احساس ہوجاتا ہے کہ شفق سوپوری طنز و مزاح کے فن کی باریکیوں سے بھرپور واقفیت رکھنے کے ساتھ

ساتھ خاکہ نگاری کے فن میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔

آخر پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ شفق سوپوری نے ادب کی مختلف اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کا یہ فرمانا درست ہے کہ شفق بے شک اہم ترین شاعر ہیں لیکن شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک محقق، نقاد، کالم نویس، فیچر نگار اور طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔ یعنی شفق سوپوری ایک ہمہ جہت تخلیقی فن کار ہیں جن کا قلم شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں یکساں طور پر کمال خوبیوں کے ساتھ چلتا ہے۔

کتابیات

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱	آل احمد سرور، پروفیسر	اردو شعریات	اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کشمیر	۱۹۸۷ء
۲	آزاد جان محمد	جموں و کشمیر کے اردو مصنفین	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرنگر	۲۰۰۴ء
۳	اشرف آثاری، ڈاکٹر	عصری ادب کے رنگ و آہنگ	اردو اکیڈمی جموں و کشمیر	۲۰۱۴ء
۴	بسم اللہ نیاز احمد	اردو گیت	ادارۂ فکر جدید نئی دہلی	۱۹۸۶ء
۵	جاوید انور	وادی کشمیر کے چند اہم شعرا	ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی راجوری جموں	۲۰۱۲ء
۶	جگن ناتھ آزاد	تعمیر فکر	کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں	۲۰۰۳ء
۷	حامدی کاشمیری	یک شہر گماں	کمپیوٹر سیٹی سری نگر	۲۰۰۵ء
۸	حامدی کاشمیری	ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب	گلشن پبلیشرز سری نگر	۱۹۹۱ء

۹	رحمت یوسف زئی	اردو غزل	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ	۲۰۱۰ء
۱۰	رفیق راز	انہار	استعارہ پبلیکشنز نئی دہلی	۲۰۰۴ء
۱۱	رفیق راز	مشراق	تحریک ادب وارانسی	۲۰۰۹ء
۱۲	رفیق راز	نخلِ آب	الحیات پرنٹو گرافس سری نگر	۲۰۱۵ء
۱۳	ریحانہ اختر، ڈاکٹر	رفیق راز آئینہ تمثال دار	ایجوکیشنل پبلیکشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۱۴	سلیم سالک	شعر، شعور اور شعریات	ایجوکیشنل پبلیکشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۰۶ء
۱۵	سید محمد عقیل، پروفیسر	غزل کے نئے جہات	کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں	۲۰۰۳ء
۱۶	سید امین اشرف، ڈاکٹر	بہاری ایجاد	میزان پبلیکشنز سری نگر	۲۰۰۷ء
۱۷	سیفی سرونجی، ڈاکٹر	نئی غزل نئے امکانات	انتساب پبلیکشنز سیفی لائبریزی سرونج	۱۹۸۴ء
۱۸	سروری عبدالقادر	کشمیر میں اردو (تین جلد)	جے کے آفسٹ پرنٹورز	۱۹۸۴ء
۱۹	شبینہ پروین، ڈاکٹر	اردو غزل کی ثقافتی اساس	جے کے بک شاپ سری نگر کشمیر	۲۰۰۸ء

۲۰	شفق سوپوری، ڈاکٹر	دل خاک بسر	ایجوکیشنل پبلیکشنز ہاؤس نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۲۱	شفق سوپوری، ڈاکٹر	بیتے موسموں دکھ	عفیف آفسیٹ پرنٹس دہلی	۱۹۹۲ء
۲۲	شفق سوپوری، ڈاکٹر	دشت میں دور کہیں	مہدی پبلیکشنز عشہ پیر سوپور کشمیر	۲۰۰۷ء
۲۳	شفق سوپوری، ڈاکٹر	موسیقی شاعری اور لسانیات	ایجوکیشنل پبلیکشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۱۲ء
۲۴	شفق سوپوری، ڈاکٹر	مخزن موسیقی	عفیف آفسیٹ پرنٹس دہلی	۲۰۰۹ء
۲۵	شفق سوپوری، ڈاکٹر	اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی	ایجوکیشنل پبلیکشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۱۱ء
۲۶	شفق سوپوری، ڈاکٹر	جہات	عفیف آفسیٹ پرنٹس دہلی	۲۰۱۲ء
۲۷	شفق سوپوری، ڈاکٹر	کلام فیض کا عروضی مطالعہ	عفیف آفسیٹ پرنٹس دہلی	۲۰۱۱ء
۲۸	شفق سوپوری، ڈاکٹر	غ،م، طاؤس فن اور شخصیت	عفیف آفسیٹ پرنٹس دہلی	۱۹۸۹ء

۲۹	شفق سوپوری، ڈاکٹر	نیلیما	ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۱۶ء
۳۰	شمس الرحمٰن فاروقی	آزادی کے بعد اردو غزل (ایک انتخاب)	مظہر مہدی قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی	۲۰۰۹ء
۳۱	شہاب عنایت ملک، پروفیسر	اردو کا سیکولر کردار	سنٹر فار پروفیشنل اسٹوڈیز ان اردو جموں	۲۰۰۸ء
۳۲	عبادت بریلوی، ڈاکٹر	جدید شاعری	ایم، اے، آفسیٹ پرنٹرس دہلی	۲۰۰۵ء
۳۳	فرید پربتی	گفتگو چاند سے	ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۳۴	فرید پربتی	شہ زور کاشمیری شخص اور شاعر	میزان پبلیکیشنز سری نگر کشمیر	۲۰۱۱ء
۳۵	فرید پربتی	ہجوم آئینہ	ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۱۰ء
۳۶	قدوس جاوید، پروفیسر	متن معنی اور تھیوری	ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہاؤس نئی دہلی	۲۰۰۸ء

۳۷	قمر رئیس، پروفیسر	معاصر اردو غزل	اردو اکیڈمی دہلی	۱۹۹۴ء
۳۸	مظہر امام	تنقید نما	میزان پبلیکشنز سری نگر کشمیر	۲۰۰۴ء
۳۹	محی الدین صوفی	جموں و کشمیر سیاسی اور ثقافتی تبدیلیاں	صنوبر پبلیشرز سری نگر	۱۹۷۸ء
۴۰	ممتاز الحق، ڈاکٹر	اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۴ء
۴۱	نذیر آزاد	نغمۂ زنجیر پا	سر چشمہ حیات پبلیکشنز کشمیر	۱۹۹۲ء
۴۲	نذیر آزاد	سبو چہ	آزاد میموریل فاؤنڈیشن کشمیر	۲۰۰۸ء
۴۳	نشاط شاہد	جدید غزل	معیار پبلیکشنز	۱۹۷۸ء
۴۴	وزیر آغا، ڈاکٹر	اردو ادب میں طنز و مزاح	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۹ء
۴۵	ہمدم کاشمیری	دھوپ لہو کی	نئی صدی ادبی سوسائٹی وارانسی	۲۰۰۳ء
۴۶	ہمدم کاشمیری	ورق سادہ	نئی صدی ادبی سوسائٹی وارانسی	۲۰۱۲ء

رسائل وجرائد

۱۔شیرازہ، جموں وکشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، جموں اینڈ کشمیر اکاڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر، جلد ۷۳ شمارہ ۶-۸

۲۔شیرازہ، ہم عصر شعری انتخاب نمبر، جلد ۴۸ شمارہ ۱۔۱۲

۳۔شیرازہ، حکیم منظور نمبر، جلد ۴۶، شمارہ ۴۔۷

۴۔شیرازہ، حامدی کاشمیری نمبر، جلد ۴۵ شمارہ ۴۔۷

انٹرویوز

۱: ایک شخصی انٹرویو، از حامدی کاشمیری، ۱۵ نومبر ۲۰۱۵ء بمقام سری نگر

۲: ایک شخصی انٹرویو، از پروفیسر شہپر رسول، بتاریخ ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء

۳: پروفیسر شہاب عنایت ملک سے نجی گفتگو، بتاریخ ۱۳ اگست ۲۰۱۵ء

۴: شخصی انٹرویو از رفیق راز، بتاریخ ۸ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقامِ سرینگر کشمیر

۵: شخصی انٹرویو از ڈاکٹر نذیر آزاد، بتاریخ ۲۰ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقامِ سرینگر کشمیر

۶: پروفیسر شہزاد انجم: ایک شخصی انٹرویو، ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء بمقام دہلی

۷: ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی: ایک شخصی انٹرویو، ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۸: ڈاکٹر راشد انور راشد: ایک شخصی انٹرویو، ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۹: ڈاکٹر سراج اجملی: ایک شخصی انٹرویو، ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء بمقام علی گڈھ

۱۰: ریحانہ اختر: ایک شخصی انٹرویو، ۲۵ ستمبر ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر

۱۱: ڈاکٹر شفق سوپوری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۴ اگست ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۱۲: ڈاکٹر پرویز احمد وانی: ایک شخصی انٹرویو، ۲۶ اگست ۲۰۱۵ء بمقام سوپور کشمیر

۱۳: پروفیسر جاوید قدوس: ایک شخصی انٹرویو، ۱۴ اگست ۲۰۱۵ء بمقام جموں

۱۴: سید رفیق الحسن قادری: ایک شخصی انٹرویو، ۲۵ اکتوبر، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر

۱۵: سید غلام رسول خطائی: ایک شخصی انٹرویو، ۶ ستمبر، ۲۰۱۵ء بمقام سرینگر کشمیر